روزنامچہ

یا

مجنوں کی ڈائری

از

قاضی عبدالغفار صاحب مصنف "لیلےٰ کے خطوط"

محمد یعقوب حسن

مالک و مہتمم دارالادب پنجاب۔ بارود خانہ سٹریٹ۔ لاہور

نے

بعد اخذ حقوق دائمی باہتمام حافظ محمد عالم پرنٹر عالمگیر الیکٹرک پریس لاہور میں چھپوا کر شائع کیا!

ماضی

متاعِ رفتہ ہے ———— اس کا غم کیا؟

حال

رفتنی اور گذشتنی ہے ———— اس کا فکر کیا؟

استقبال

کا تخیل زندگی ہے! اسی سے یہ اوراق نسبت قریب رکھتے ہیں

شرح کلام

جس زمانہ میں "لیلیٰ" کے خطوط شایع ہو رہے تھے اور پڑھنے والے دلچسپی کے ساتھ ان کو پڑھ رہے تھے، میرے اکثر احباب نے مجھے اس امر پر متنبہ کرنا ضروری سمجھا کہ "لیلےٰ" کا طرز بیان بہت بے حجاب ہے اور اعتدال کی حد سے گزرا ہوا۔ بعض نے تو یہ بھی کہا کہ "لیلےٰ" کی یہ حرکت کہ وہ مذہب اور انسانیت کے بہترین مسلّمات کے ساتھ کھیلتی ہے اور شوخیاں کرتی ہے قطعاً ناروا ہے۔ میں نے اس وقت ان احباب سے جو کچھ عرض کیا تھا وہی اب عرض کرتا ہوں، یعنی ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

"لیلیٰ کے خطوط" میں جو داستان میں بیان کرنا چاہتا تھا۔ اس کے لئے موزوں طرز بیان وہی تھا۔ جو "لیلیٰ" نے اختیار کیا۔ عورت کی مظلومیت کا افسانہ ہندوستان کے ماحول میں کسی شریف گھر کی بیٹی یا بہو کی زبان سے بیان ہونا ممکن نہ تھا۔ لامحالہ

ایک بازاری عورت کے قلم سے وہ عبرت انگیز حقائق بیان کرانے پڑے جن کو ذرا کم بے حجاب اور زیادہ سنجیدہ طرز بیان بے اثر اور بے معنی کردیتا۔ جو نوک خار میں چاہتا تھا کہ ان موٹی کھالوں میں چبھے جن پر معمولی چٹکیوں کا کبھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ نوک خار سنجیدگی اور اعتدال کی حدود میں اکثر بے اثر رہتی ہے۔ درحقیقت میں مجبور تھا کہ "لیلےٰ" کے قلم کی نوک سے ان موٹی اور سخت کھالوں میں سوراخ کراؤں! اپنے مقصد میں کس حد تک مجھے کامیابی ہوئی اس کا اندازہ وہی لوگ کرسکیں گے جنھوں نے "لیلیٰ کے خطوط" کو محض اس کی ادبی چاشنی کی خاطر نہیں بلکہ اس مقصد اعلیٰ کو پیش نظر رکھ کر پڑھا ہے جو لیلیٰ کے قلم کی روانی میں ہیشہ ہی ساری داستان گوئی کی روح رواں ہے۔ وہ ایک عورت کے خونچکاں کفن کے چند دھبے تھے جن کا عکس ان خطوط میں پیش کیا گیا۔

یہ روزنامچہ بھی اسی قسم کی ایک کوشش اور ایک قلمی تصویر ہے۔ جس میں عہد جدید کے ایک ہندوستانی نوجوان کی معنوی کیفیات کو بے نقاب کرنے کے چند پہلو پیدا کئے گئے ہیں۔ محض ادبی نقاشی نہ "لیلیٰ کے خطوط" کا

مقصد تھا نہ "روزنامچہ" کا ہے۔ پس جو لوگ سطحی طور پر ان اوراق کی ادبی خوبیوں کی داد دیں اور ان نقوش کی معنوی اہمیت پر نظر نہ کریں، ان کی طرف سے مجھے داد ملی بھی تو کیا۔ —— میرے نزدیک وہ "تحسین ناشناس" ہے۔

اگر میرے ادّعا کو خود بینی پر محمول نہ کیا جائے تو اتنا ضرور عرض کروں کہ "روزنامچہ" کا ایک حرف بھی محض زورِ قلم کا مظاہرہ کرنے کے لئے نہیں لکھا گیا، میرا یہ "روزنامچہ نگار" ایک تعلیمیافتہ اور دولتمند نوجوان ہے، بے فکرا کھلنڈرا۔ وہ ہر حال میں —— روتے ہوئے، ہنستے ہوئے، بگڑتے ہوئے جھنجھلاتے ہوئے، غصّہ میں، مرتے ہوئے، عشق میں، عیّاشی میں، مےنوشی میں، یاروں کی صحبت میں، بمبئی کے کٹم خانوں میں، تنہائی کی راتوں میں، وصل کی شب میں۔ اختر سے گفتگو یا مولانا یا میر صاحب سے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے —— ہر حال میں جو کچھ لکھتا ہے، جو نقش کاغذ پر بناتا ہے وہ ہر نقش اس کی معنوی کیفیت کا حامل ہے —— متلاطم کیفیات، جنھوں نے اس کی زندگی کا لنگر توڑ دیا ہے! مختصر یہ کہ ان اوراق کی چادر میں چند مقاصد اور حقائق لپٹے ہوئے ہیں۔

ایک ایسے انسان کی زندگی کی معنوی حقیقت بیان کرنے کے لئے جس

نے مذہب، اخلاق اور جذبات کی تمام حدود کو توڑ ڈالا ہو۔ طرز بیان بھی اُن حدود کے اندر محدود نہیں رہ سکتا۔ بعض اوقات کلام کی سنجیدگی مطالب کا خون کردیتی ہے۔ اور اکثر مشاہدۂ حق کے لئے بادہ وساغر کی ہیجابیاں ناگزیر ہوتی ہیں ؁

اس تمہید کے بعد چند الفاظ میں عرض کردوں کہ میرا موضوع ہے کیا؟ دور جدید کے وہ نوجوان جو تعلیمیافتہ کہے جاتے ہیں اور جو زندگی کی کشمکش سے فارغ رہ کر اپنے جذبات اور محسوسات کی زنجیریں کھول دیتے ہیں۔ ہمہ تن ایک جہل مرکب بن جاتے ہیں اور زندگی کے مسلمات سے بے نیاز اور بے خبر ہوکر اپنے لئے جہل مطلق کی ایک نئی دنیا بنا لیتے ہیں۔ اس بے علمی کے ساتھ ساتھ جس کا نام ہمارے ملک میں "تعلیم" رکھا گیا ہے۔ نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اپنے مرکز ثقل سے ہٹتی جاتی ہے۔ اس کا توازن فنا اور اس کی زندگی میں ایک خوفناک انتشار پیدا ہو رہا ہے۔ صحیح تربیت کے بغیر ایک ایسی، تعلیم جو مشرق ومغرب کے بہت سے علوم کا ایک نامکمل اور غیر مرتب مرکب ہو، یا تو ایسے جانور پیدا کرتی ہے جو کسی نہ کسی طرح دو وقت کی روٹی کماتے ہیں

اور مر جاتے ہیں یا ایسے نوجوان پیدا کرتی ہے جو عقل اور مذہب دونوں سے برگشتہ ہو کر زندگی کا مقصد صرف اتنا جانتے ہیں کہ ادنیٰ جذبات کی لگام ڈھیلی چھوڑ دیں اور جوانی کے گرم خون کو اور بھی زیادہ گرم ہو کر دوڑنے دیں۔ وہ مذہب کی رہنمائی سے محروم رہتے ہیں، اس لئے کہ داعیان مذہب ان کے حال پر نظر ہی نہیں کرتے نہ ایسا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ان "حاملان شریعت حقہ" کو اس حقیقت کا کچھ علم نہیں کہ مسلمانوں کی اس نسل میں جو تیرہ سو، ۱۳۰۰ برس پہلے پیدا ہوئی تھی اور اس نسل میں جو اب پیدا ہو رہی ہے اور دنیا کے انقلابات کی گود میں پرورش پا رہی ہے، کس قدر فرق اور بعد ہے۔ وہ کہتے ہیں ـــــ ہمارا یہ مذہبی پیشوا ـــــ کہ جب کتاب میں لکھنے والا یوں لکھ گیا تو پھر یوں ہی صحیح ہے۔ اگر وہ کتاب چھ سو برس پہلے لکھی گئی یا نو سو برس پہلے تاہم اس کا "حکم" زمانہ کے فصل وبعد پر یکساں حاوی ہے اور حاوی رہے گا! اجتہادات کا دروازہ بند ہے! ایک مسجد کے ٹوٹے ہوئے لوٹے کے متعلق بھی اجتہاد نہیں کیا جا سکتا! دنیا کچھ سے کچھ ہو جائے۔ عقل اور سائنس کی طاقتیں انسانوں کو مشین بنا دیں اور زندگی کا نقشہ بدل ڈالیں، لیکن جو لکھا ہے وہی لکھا رہے گا! نوجوانوں کے سامنے زندگی کے نئے نئے حقائق منکشف

کی تعلیم پیش کرتی ہے۔ وہ ان حقائق کو قبول کرنے میں کہیں ان کے اور اپنے قدیم عقاید کے درمیان توازن قائم نہیں کر سکتے اور بالآخر بھٹک جاتے ہیں۔ اہل مذہب کی خود فریبیاں اور خود مختاریاں ان کو مذہب سے بآسانی منحرف کر دیتی ہیں اور پھر ان کی کشتی ایک ایسے متلاطم سمندر کی ہواؤں اور موجوں کے حوالہ ہوتی ہے جس کی سطح پر بڑے بادبان روئی کے گالوں کی طرح اڑتے رہتے ہیں، دوسری طرف مغربی تعلیم جو ان نوجوانوں کو ملتی ہے اس کا یہ حال ہے کہ وہ بی۔ اے یا ایم۔ اے اور ڈاکٹر اور علامہ تو پیدا کر دیتی ہے، مگر انسان پیدا نہیں کر سکتی۔ سب کچھ اس تعلیم سے حاصل ہوتا ہے، سوائے علم کے، چند صفحے تاریخ کے ـــــ وہ بھی اپنی نہیں ـــــ چند صفحے جغرافیہ کے، چند قاعدے ریاضی کے، چند مبادی سائنس کے، دو ایک کتابیں انگریزی ادب کی۔ ایک دو رسالے اردو، فارسی یا ہندی کے ـــــ یہ نسخہ ہے "کوفتہ، بیختہ، آمیختہ بنوشند" اس نسخہ کی دوائیں معدہ سے حلق تک بھری جاتی ہیں۔ پھر ان نوجوانوں کو ایک سیاہ چغہ کاندھوں پر ڈالنے کے لئے، ایک سپاٹ مثلث سر پر رکھنے کے لئے عطا کیا جاتا ہے۔ اس طرح سے زندگی کی کشاکش کا مقابلہ کرنے کے لئے نئے سپاہی تیار ہوتے ہیں۔ قصور کس کا ہے؟ کسی کا ہو! مگر ان

غریب نوجوانوں کا تو یقیناً نہیں ہے جن کو کالجوں میں اس طرح پیسا، گھولا، اور چھانا جاتا ہے۔ کہ جب وہ کالجوں اور اسکولوں سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں تو ان کو آنکھوں سے نظر نہیں آتا، دماغ معطل ہوتے ہیں اور کمر ٹیڑھی! پھر وہ دونوں طرف سے ٹھوکریں کھاتے ہیں، مذہب والے ان کو مردود و ملعون کہہ کر دھتکارتے ہیں اور دنیا والے ان کو دو وقت کی روٹی کمانے نہیں دیتے ہیں۔ ہر طرف سے تنگ آکر وہ یا تو مذہب والوں کی خامیوں کو مذہب سے منسوب کر دیتے ہیں اور دہریہ اور منکر ہو جاتے ہیں، یا تعلیم دینے والوں کے تمام عیوب کو علم سے منسوب کر کے معاشیات و اقتصادیات کے موجودہ نظام سے بغاوت کرتے ہیں اور سوشلزم کے جھنڈے کے نیچے زندگی کا ایک نیا نقشہ بنانے کی کوشش شروع کر دیتے ہیں، مذہب اور دنیا کی مسلمہ اخلاقی پابندیوں سے آزاد ہو کر وہ بے تکلف اپنے تمام اضطراری جذبات کی کارفرمائی کو زندگی کا مقصود قرار دے لیتے ہیں، اور یوں اس انتہا یا اُس انتہا پر اپنی زندگی کو ختم کرتے ہیں۔

ان اوراق میں جو نقوش پیش کیے جا رہے ہیں وہ ایسے ہی نوجوانوں میں سے ایک نوجوان کی معنوی زندگی کا عکس ہیں۔ ایک خاص نکتہ جو توجہ کے قابل ہے شخصی اجتہاد کا وہ غلبہ ہے جو "روزنامچہ نگار" کے ہر قول و فعل سے ظاہر ہوتا ہے

وہ دوسروں کے بنائے ہوئے اصولوں اور معیار کا پابند ہونا گوارا نہیں کرتا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں، سیاست ہو یا اخلاق، یا مذہب، وہ اپنے لئے اپنے ہی معیار پر ہر چیز کو جانچتا ہے۔ اور کچھ پروا نہیں کرتا کہ دنیا کیا کہے گی، یہ اس کا بے خوف آزاد اور غیر متوازن اجتہاد اس کو ہر سمت میں دوڑاتا ہے اور کسی سمت میں قرار نہیں لینے دیتا۔ وہ اپنے نفس کو ہر پابندی سے آزاد اور اپنی ہر خواہش کو بے لگام رکھنا چاہتا ہے، وہ دنیا سے ہر بہتر چیز اپنے لئے حاصل کرنا چاہتا ہے، دنیا کچھ نہیں چاہتا، کامیاب ہونا چاہتا ہے۔ بغیر کوشش کے، اڑنا چاہتا ہی بغیر پروں کے اور جب بہت سے امکانات غیر ممکن ثابت ہوتے ہیں تو جھلاتا ہے، بگڑتا ہے، اور کدال لیکر کبھی مذہب کے محراب و منبر پر حملہ کرتا ہے، کبھی تمدن کے میناروں پر یورش، یہ اس کا حال ہے، یہ اس کی معنوی زندگی ہے۔ یہ کشاکش ہے جس میں وہ مبتلا ہے، اپنی مجبوریوں کو محسوس کر کے وہ موت کا بھی مقابلہ کرنا چاہتا ہے اور خودکشی کا ایک نیا فلسفہ پیش کر کے موت کے مقابلہ میں اپنی آزادی و خود مختاری ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے ——— اس طرح زندگی کی قدامت کے خلاف وہ اعلان جنگ اور اعلان بغاوت کرتا پھرتا ہے۔ کم نظر اس کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مگر وہ صرف اس کا ظاہر دیکھتے ہیں، اس کے باطن کو نہیں دیکھتے، ان طوفانوں کو نہیں دیکھتے

جو اس کے اندر برپا رہتے ہیں!

اگر آپ ان اوراق کو پڑھتے وقت بین السطور بھی دیکھتے جائیں گے تو آپ بہ آسانی معلوم کر سکینگے کہ باوجود اس بغاوت کے جس کا عَلم یہ باغی بلند کئے ہوئے ہے کبھی کبھی جوہر اصلی کی ایک جھلک اس کی زندگی میں نظر آتی ہے جس طرح شب کی تاریکی میں اور جنگل کے کسی تاریک کونے میں ایک کرمک شب تاب کی چمک! مثلاً عورت کے متعلق وہ شدت کے ساتھ اپنی خود غرضانہ نفس پرستی کا اعلان کرتا ہے۔ لیکن اپنی تمام عیاشی اور عیش پرستی میں جب کبھی محبت کی ایک لرزش اس کے اندر پیدا ہوتی ہے تو وہ دنیا کا باغی ایک جھٹکا محسوس کرتا ہے اور اپنے میدان جنگ میں بڑھتے بڑھتے یکایک رک جاتا ہے۔ نفس کی اس خود مختاری کے اس زرہ بکتر کے نیچے ایک کمزور نقطہ موجود ہے۔ جوہر اصلی کی ایک چنگاری باقی ہے جو دل کے کسی تاریک گوشے میں دبی پڑی ہے۔ لیکن "مذہب" کے ٹھیکیدار ایک طرف اور عقل کے علمبردار دوسری طرف ——— دونوں میں سے کوئی اس چنگاری کے وجود کی پروا نہیں کرتے بلکہ محض سطح کو دیکھ کر ہی فیصلے اور فتوے صادر فرماتے ہیں۔ طبیب بخار کا علاج کرتا ہے اور دن میں چار چار دفعہ نسخے بدلتا ہے مگر جن اسباب کا بخار ایک ظاہری نتیجہ ہے۔ ان کی جستجو نہ کرتا ہے

نہ ایسا کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ پھر جب مریض کو کسی طرح شفا نہیں ہوتی تو بہت حیران ہوتا ہے کہ یہ بات کیا ہے اپنی بدعقلی کا اسے خیال بھی نہیں آتا، الزام رکھتا ہے مریض پر!!

مجھے کچھ زیادہ امید نہیں کہ میرے یہ اشارے سونے والوں کے حلق میں گھُسکر ان کے خراٹوں کو بند کرسکینگے، لیکن اگر سننے والوں کے کان پٹ ہوں تو اس کے کبھی یہ معنی نہیں ہوسکتے کہ بولنے والوں اور کہنے والوں کی زبان بھی گنگ ہوجائے، ابھی تو اس گفتگو کا آغاز ہے۔ "لیلی کے خطوط" اور "روزنامچہ" کی داستان ابھی باقی ہے جو اس سلسلہ کے آئندہ اقساط میں پیش کی جائیگی ؛

عبدالغفار

حیدرآباد دکن

۱۲ر جولائی ۱۹۳۴ء

عرضِ ناشر

قاضی عبدالغفار صاحب ہندوستان کے ان معدودے چند انشا پرداز بزرگوں میں سے ہیں، جن پر ہندوستان اور اردو ادب بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ آج تک آپ کی جتنی تصانیف شائع ہو کر بازار میں آچکی ہیں وہ سب ایسی تھیں کہ قاضی صاحب نے ہنگامی تاثرات سے متاثر ہو کر یا کسی وقتی جذبات کے ماتحت تصنیف فرمائیں لیکن "لیلیٰ کے خطوط" روزنامچہ یا دیگر کتابیں جو آج قاضی صاحب تحریر فرما رہے ہیں وہ ایک مستقل حیثیت رکھتی ہیں۔ اور موصوف خاص اس جذبے سے مجبور ہو کر لکھ رہے ہیں جو ان کے حساس دل کی گہرائیوں میں ایک مدت سے نہاں تھا اور جو آج ایک زبردست کھولاؤ اور جوش کے ساتھ نمایاں ہو رہا ہے۔ میری کس قدر خوش قسمتی ہے کہ اتنا مخلص، ایثار پیشہ اور

بیمثل انشا پرداز میری حقیر خدمات کو شرف قبولیت بخش رہا ہے اور آپ نے ازراہ شفقت میرے ساتھ وعدہ فرمالیا ہے کہ وہ اپنی تمام تصانیف میرے ذریعہ سے شایع فرمائینگے۔ میرے پاس ان کی سپاس گزاری کے لئے الفاظ نہیں ہیں۔ صرف ایک چیز ہے خدمت گزاری ع

گر قبول افتد زہے عزّ و شرف

محمد یعقوب حسن
مالک و مہتمم دار الاذب پنجاب بارود خانہ سٹریٹ
لاہور

۱۸ فروری سنہ ۱۹۲۹ء

صبح ۵ بجے سویا، دو بجے سہ پہر کو جاگا، رات بھر ناچ دیکھتا رہا تھا۔ اور تھوڑی تھوڑی پیتا بھی رہا تھا۔ یاروں کی محفل میں اگر نہ پیجئے تو عیش گونگا بہرا لنگڑا، اپاہج ہو جاتا ہے! ....

یہ کون تھیں جو رات میرے قریب بیٹھی ہوئی تھیں؟ سنتا ہوں کہ کوئی نئی آئی ہیں۔ خاصی دلفریب ہیں۔ عمر تو بہت کم معلوم ہوتی ہے۔ ابھی چھوکری پن چہرہ پر برس رہا ہے اور شرمائی کس قدر ہیں! گھنٹوں میں نے سر پٹکا مگر اللہ کی بندی نے کھل کر بات ہی نہ کی! اجی شرم ورم تو کیا۔ میں تو سمجھتا ہوں بہت چالاک اور پرفن ہونگی۔ یہ انداز شرم بھی گویا ایک ہتھیار تھا! وہ سگریٹ جو ہاتھ سے گرایا وہ بھی ایک ترکیب تھی کہ میں اس کو اٹھا کر پیش کروں اور ان کی طرف توجہ کروں! اللہ بچائے عورت کے چلتروں سے۔ کیسی شکر چڑھی ہوئی گولیاں ہیں اندر سے کڑوی۔ باہر سے میٹھی! بلیوں کے پنجے —— نرم بالوں کے اندر چھپے ہوئے

خوب دیکھ لیا۔ ان سب کو اِسندربائی نے کیسا کیسا ٹھگا۔ ناک چنے چبوا دیئے۔!
بی مشتری نے کیا کیا جھکوسے دیئے۔ دو برس تک کیسے کڑوے گھونٹ پلائے
روپیہ بھی دو۔ خوشامدیں بھی کرو۔ گالیاں بھی سنو۔ جوتیاں بھی کھاؤ۔ دنیا میں اپنی ناک
بھی کٹاؤ۔ روتے روتے مرجاؤ۔ مگر پتھر میں جونک نہیں لگتی! خدا ہی بچائے ان جادو
گرنیوں سے! اب ذرا ان بی "لیلیٰ" کے رنگ بھی دیکھنے ہیں۔ بات ہی نہیں
کرتیں۔ بیٹھی ہیں میرے پاس، مگر بولتی نہیں بیچاری! جلتا ہوا سگریٹ ہاتھ
سے چھوٹ کر فرش پر گر گیا —— گویا اتفاقیہ ایسا ہوا، جی ہاں! خوب سمجھتا ہوں
ایسی ننھی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں، جان کر گرایا، تاکہ میں اس کو اٹھا کر ان کی طرف
متوجہ ہو جاؤں! کیا میں ان ترکیبوں کو جانتا نہیں۔ کمان زید کی طرف کھینچیں اور
تیر لگے بکر کے سینہ پر! —— ان کو بھی دیکھنا ہے! ابھی ذرا نو گرفتار ہیں! ——
پیر صاحب تو کہتے تھے کہ ان کو اس شہر میں آئے آٹھ ہی دن ہوئے ہیں۔ مگر اپنے فن
کے سب امتحان پاس کر کے آئی ہونگی۔ ان قبروں کے مُردوں کا صحیح حال تو صرف
دوزخ کے فرشتوں کو ہی معلوم رہتا ہے، خیر۔ حال جو کچھ بھی ہو، چیز بُری نہیں!
—— میں نے دیکھا رات دس پانچ اور بھی اسی طرف نشانہ باندھے
ہوئے تھے —— بڑا ہی حریص ہوتا ہے۔ جسے مرد کہتے ہیں! عورت کے معاملہ میں

کبھی بس نہیں کہہ سکتا۔ جو مل جائے۔ جہاں مل جائے! کچھ نہیں تو آنکھیں ہی سینک لے گا۔ اور ہے بھی یہ کہ دنیا میں آخر عورت کے وجود کی اس کے سوا اور غرض ہی کیا ہے۔ "طلب" مرد کی ہے۔ اور وہ "مطلوب" ہیں، باغوں کے پھول بھی تو اسی لئے دامن میں بھرے جاتے ہیں کہ وہ حسین ہیں اور معطر، ان کی نوع یکسر "مطلوب" ہے۔ فطرت کے تقاضوں کو نہ قانون باندھ سکتا ہے، نہ مذہب! وہ تو ہمیشہ آزاد ہی رہے اور آزاد ہی رہینگے۔ ——————

مرد مرد ہی رہیگا اور عورت عورت ہی ——————

۲۵ فروری ۱۹۲۹ء

میر صاحب کو "لیلیٰ" کے گھر بھیجا تھا۔ میں نے کہا ذرا خبر تو لائیں کہ رنگ کیا ہیں کتنے کتنے پانی میں ہیں، منزل دور ہے یا قریب! کتنا دوڑائیں گی، اور تھکائیں گی —— مگر میر صاحب تو یہ خبر لائے کہ وہ سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتیں اور جو بات کرتی ہیں تو سو من کی۔ اٹھائے نہ اٹھے۔ پڑھی لکھی بھی معلوم ہوتی ہیں۔ میر صاحب گئے تو مطالعہ میں مشغول تھیں۔ یہ اپنا سا منہ لئے بیٹھے رہے اور وہ مطالعہ میں مشغول رہیں۔ جب میر صاحب نے میرا ذکر چھیڑا اور محفل کی ملاقات اور سیگریٹ والا واقعہ یاد دلایا تو کہنے لگیں —— "جی ہاں، کوئی صاحب

بیٹھے تو تھے۔ میں تو یہاں اجنبی اور نو وارد ہوں اور اس کے علاوہ ملنے جلنے کا کچھ شوق بھی نہیں۔ وہ میرے غریب خانے پر تشریف لانا چاہیں تو تشریف لے آئیں!"

افوہ! یہ دماغ! یہ مزاج! میں نے تو میر صاحب سے کہا تم نرے گدھے ہو، عورت سے ڈر گئے، یہ سنجیدگی تو ایک ادا ہے، ارے میاں صاف صاف مطلب بیان کیا ہوتا۔ معاملہ طے کر کے آئے ہوتے۔ کوئی ایسی راجہ کی بیٹی تو ہیں نہیں ہیں تو وہی آخر جو ہیں، میر صاحب کہنے لگے! صاحب! مجھے تو پسینہ آ گیا۔ وہ بیگم بنی بیٹھی تھیں، میں نے جو ہمت کر کے کہا کہ آپ کے حسن کا بہت چرچا ہے، تو کیا بتاؤں کیا منہ بنا کر ——— جیسے کوئی بازاری لونڈے سے بات کر رہا ہو ——— اس نے کہا۔ حسن کو آپ کیا جانیں؟ اندھوں کے سامنے چراغ! آپ لوگ تو اپنی ہوس کو جانتے ہیں، دوسروں کے حسن سے واقف نہیں! آپ حسن کو کھال کے اوپر دیکھتے ہیں اور وہ ہوتا ہے کھال کے نیچے۔ کچھ اور عقل و تمیز کی باتیں کیجیے ———" میر صاحب کہنے لگے میں تو یہ لکچر سن کر ٹھنڈا ہو گیا، کہتا کیا؟ ——— خیر، میں نے کہا، یہ رنگ بھی دیکھنا ہے۔ ایک دن آئیں تو! زر بہ سر فولاد، سب فلسفہ رکھا رہ جاتا ہے۔ ———

۱۲ر مارچ ۲۹ء

کیا کیا رسہ کشی ہوئی ہے۔ بارے کل شام تشریف لائیں۔ کچھ بھی کہو۔ عورت تو ذہین اور دلچسپ ہے۔ ایسی سلجھی ہوئی باتیں کرتی ہے کہ میں تو حیران رہ گیا پھر اس کا حسن اور اس کی نوعمری! میں نے تو بیتاب ہوکر یہاں تک کہدیا کہ روز شام کو تشریف لایا کیجئے۔ مگر کیا صاف جواب دیا ہے ظالم نے! کہنے لگی "جی ہاں! اگر روز آپ ہی کی خدمت میں حاضر ہو جایا کروں تو میری جان کھانے والے دس پانچ اور جو ہیں وہ کہاں جاکر سر کھوڑیں؟ میں جائداد مشترکہ ہوں سرائے کی بھٹیاری ہوں، جو مسافر آئے اس کا بستر بچھاتی ہوں، کھانا پکاتی ہوں۔ میں اپنی سرائے چھوڑ کر کہیں باہر جا بیٹھوں تو میرے مسافر کیا کریں! آپ اگر میرے حال پر مہربان ہیں تو کبھی کبھی ضرور حاضر ہوا کرونگی۔" ہنس ہنس کر باتیں کرتی ہے مگر اس کی ہنسی میں ایک اور جھلک ہے۔ جیسے درد کی، جیسے بیمار ہنستا ہے خدا جانے ہے کون یہ عورت؟ اس قبیلہ سے تو یقیناً نہیں ہے۔ میں نے کچھ دریافت کرنا چاہا تو صاف اُڑ گئی۔

۱۴ر مارچ ۲۹ء

بہت بلایا، نہیں آئیں، کہدیا کہ فرصت نہیں ہے۔ میں نے دو تین خط

لکھے۔ جواب ملا۔ "خط لکھنے کی فرصت ہوتی تو خود ہی نہ حاضر ہو جاتی"۔

عجیب عجیب حرکتیں کرتی ہے، یار لوگوں نے تو مجھے طعنے دینے شروع کر دیئے ہیں "پھسل پڑے۔ رشتہ خطمی ہونے لگے۔ پھنسا چاہتے ہو۔" یہ لوگ سمجھتے ہی نہیں کہ اگر کوئی مرد کسی عورت کو پسند کرے تو اس کے معنی عشق و الفت کیوں سمجھے جائیں۔ عشق تو ایک بازاری اصطلاح ہے۔ لغو اور بے معنی عیش کا دوسرا اصطلاحی نام درحقیقت عشق ہے۔ واللہ! شاعروں کا عشق تو ایک عذاب ہے۔ لاحول ولا اصل چیز عورت ہے۔ اور مرد کی عورت طلب فطرت، میرا کوئی دوست کبھی میرے سامنے آکر کہتا ہے کہ "میں فلاں عورت پر مرتا ہوں" تو میں صاف کہہ دیا کرتا ہوں کہ دماغ کا علاج کیجئے۔ شے لطیف کی کمی معلوم ہوتی ہے۔ یا خود کشی کر لیجئے میرے کان کھانے کیوں آگئے۔ میاں اختر ایک دفعہ کسی چھوکری پر عاشق ہو کر ہائے ہائے کرتے میرے گھر آئے۔ لگے ہچکیوں سے رونے۔ میں نے کہا کچھ باؤلا ہو گیا ہے، الّو کہیں کا۔ اگر عشق بازی ہی کرنا چاہتا ہے تو جو عورت آسانی سے حاصل ہو سکے۔ اس سے کرے عشق بازی! دس پانچ مہینے۔ اگر شریفوں کی سی عشق بازی کرنا ہے اور جو عورت نہ مل سکتی ہو اس کے لئے ریں ریں کرنے سے کیا حاصل —— چل بھاگ یہاں سے —— تیرا معدہ خراب ہے یا جگر ماؤف ہے

اختر میاں اس دن مجھ سے بہت خفا ہو گئے اور جب تک مبتلائے عشق رہے خفا ہی رہے۔ جب وہ بھوت سر سے اترا تو پھر ایک دن آئے۔ شرمائی ہوئی ہنسی ہنستے ہوئے۔ ارے بھائی معاف کرو۔ لاحول ولا۔ کس خبط میں مبتلا ہو گیا تھا میں! لعنت بکار شیطان! اس چھوکری نے تو ناک چنے چبوا دیئے۔ خیر جھگڑا کٹا —— اب تو سنتا ہوں اس کی شادی ہونے والی ہے۔ پہلے تو میرے ہی پاس پیام آیا تھا کہ شادی کر لو۔ میں نے کہا لاحول ولا قوۃ، کہاں عشق کہاں نکاح! عشق بازی کہاں اور نکاح کہاں! میں نے کہلا بھیجا کہ نیک بخت جہاں تمہارا دل چاہے شادی کر لو میری عشق بازی نکاح کی خشکی کا تحمل نہیں کر سکتی! کیوں کیسی کہی —— پھر کہنے لگا۔ یار سنتے ہیں ایک نئی آئی ہوئی ہیں، تم نے تو خوب ربط و ضبط پیدا کر لیا ہے ہمارا بھی کچھ حصہ ہے یار —— میں نے کہا باؤلے ہوئے ہو، میرا ہی حصہ کہاں ہے جو تمہارا ہو، وہ تو کچھ عجیب ہی ہے۔ ——

۲۱ مارچ،

بہت برا دن گزرا، مولانا خیر الزماں صاحب خدا جانے کہاں سے (ہر بلیہ کز آسماں آید) نازل ہو گئے۔ پھر جب وہ آتے ہیں تو قطب بن کر جم جاتے ہیں!

ان کی عرفانیات کا ترشح ٹپاٹپ شروع ہوتا ہے۔ گویا انسان ٹپکتی ہوئی چھت کے نیچے بندھا بیٹھا ہے! حسب معمول مولانا کے پند و نصائح کا پٹارہ کھل گیا، یہ گناہ، وہ گناہ۔ یہ صغیرہ۔ وہ کبیرہ، دوزخ اور فرشتے اور منکر اور نکیر۔! غرض ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر فرماتے میرا ناک میں دم کر دیا۔ کہنے لگے میاں! اب تم شعور کی عمر تک پہونچ گئے ہو۔ اب ذرا اپنے ضمیر سے محاسبہ کیا کرو۔ گناہ کی زندگی کا نشہ شروع میں تو بہت خوشگوار ہوتا ہے مگر آخر میں تباہ کار ہو جاتا ہے "میرے بھائی!" ——— یہ مولانا کا تکیہ کلام ہے ——— میرے بھائی! کب تک غافل رہو گے ——— پھر انھوں نے نہ جانے کتنی آیتیں اور حدیثیں بیان کر ڈالیں ——— میں تو گناہ کا نام سنتے سنتے تھک گیا ہوں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انسان کی زندگی میں گناہ کے سوا کچھ بھی نہیں گناہ! گناہ! سوتے، جاگتے، کھاتے، پیتے، ہنستے، بولتے گناہ ہی گناہ ہے پانی پیؤ تو گناہ، روٹی کھاؤ تو گناہ، جو کچھ کرو گناہ! مولانا ہمہ تن ثواب اور ہم ہمہ تن گناہ! میں نے بھی آخر جل کر کہا کہ حضرت! آپ اپنے مذہب کا پٹارہ تو میرے سامنے کھولئے نہیں، یہ تو بازیگر کی جھولی ہے۔ میں آپ کے ڈھکوسلوں کا قائل ہی نہیں۔ جو بات آپ کہیں ذرا ساتھ ہی ساتھ اس کو سمجھاتے بھی جائیں آپ کہتے ہیں

مرد کا بغیر نکاح عورت کے پاس جانا حرام ہے۔ کیوں جناب؟ صرف اسی لئے
کہ مذہب نے مرد اور عورت کے تعلقات کے متعلق ایک قانون بنا کر ہمارے
سر پر رکھدیا ہے۔ لیکن نکاح میں ہے کیا۔ سوائے ایجاب و قبول کے۔ پھر اگر ایک
مرد اور ایک عورت کے درمیان ایجاب و قبول ہو، مگر شرعی اصطلاحات نہ
ہوں۔ تو نکاح بغیر بھی دونوں کا جنسی تعلق کیوں جائز نہیں؟ اور فرض کیجئے کہ
کوئی شخص آپ کی مصطلحات اور قانونی ڈھکوسلوں کو مانتا ہی نہ ہو تو پھر آپ
اپنا قانون اس کے حلق میں کیونکر اتار سکتے ہیں۔ جو شخص آپ کے جہنم ہی کے
وجود کا منکر ہو اس پر "خَالِدِیْنَ فِیْہَا اَبَدًا" کا کیا اثر؟ جناب مولانا؟ میں نے کہا
مرد عورت کیلئے ہے اور عورت مرد کے لئے، اس لئے نہیں کہ ان کو مذہب ایک
دوسرے کا لباس بناتا ہے، بلکہ اس لئے کہ فطرت مجبور کرتی ہے کہ مرد عورت
کی طرف آئے اور عورت مرد کی طرف جائے! زندگی کا ایک سلجھا ہوا سیدھا
سادا مسئلہ ہے جس میں مذہب نے سینکڑوں گرہیں لگا دی ہیں۔ مولانا کہنے
لگے۔ اگر فطرت ہی کے پابند ہو تب بھی تو اس نے کوئی حد اعتدال مقرر کر دی ہے،
اسی کا لحاظ کرو۔ میں نے کہا، بیشک! لیکن اگر اعتدال کی حدود سے تجاوز
کیا بھی جائے تو اس کی سزا فطرت خود دیتی ہے۔ آپ کیوں اپنا دوزخ

جنّت لے کر گھسے پڑتے ہیں؟ فطرت کے نمائندے آپ کہاں سے بن آئے؟ فرمایا کہ دین فطرت ہے۔ اور دین کے نمائندے ہم ہیں۔ میں نے کہا واہ صاحب کیا دین ہے اور کیا اس کے نمائندے ہیں۔ فطرت کا سارا ڈھانچہ توڑ مروڑ کر اس کی صورت ہی مسخ کر ڈالی۔ وراثت کا ایک نیا ڈھانچہ بنا کر کھڑا کر دیا۔ اس ڈھانچے کو قائم رکھنے کیلئے ازدواج کے قاعدے اور ضابطے مقرر کر دیئے۔ عورت اور مرد کی فطرت کو پابہ زنجیر کر دیا۔ خالص فطری جذبات کو کیا سے کیا بنا دیا۔ نتیجہ کیا ہوا؟ یہ ہوا کہ فطرت اور مذہب میں مقابلہ ہونے لگا۔ دونوں ایک دوسرے کے حریف بن گئے۔ فطرت اپنے تقاضوں کو چوری چھپے پورا کرنے لگی۔ مذہب کے دامن میں ریا و مکر کے سانپ، بچھو پرورش پانے لگے۔ ——— اور آپ ہیں کہ حلال و حرام کی ہی بحث میں سر کھپائے جاتے ہیں ——— اور فطرت مذہب کے قید و بند سے آزاد ہو کر زمین کے نیچے سرنگیں بنانے لگی۔ صاف اور ستھری حیوانیت کو آپ نے انسانیت سے خارج فرما کر ایک خالی ڈھول بجانا شروع کر دیا۔ زہد و تقویٰ کی نئی نئی اصطلاحیں گھڑی گئیں۔ اس حیوانیت کے پاؤں میں جو جزو انسانیت ہے آپ نے بیڑیاں ڈال دیں ——— عجب قسم کی یہ تنظیم ہے ——— حضرت مولانا بہت تحقیر آمیز طریقہ پر میری صورت دیکھ دیکھ کر مسکراتے جاتے تھے۔ مگر میں بھی کہے ہی گیا۔ جو منہ

میں آیا! عجب قسم کی یہ تنظیم ہے۔ مولانا! غذا سامنے رکھی ہے۔ بہت آسانی سے انسان اس کو اُٹھا کر کھا سکتا ہے۔ مگر آپ نے اس کے دستر خوان سے مُنہ تک لے جانے کے لئے ہزاروں قاعدے اور ضابطے بنا ڈالے۔ پہلے نوالہ یوں بناؤ۔ مُنہ اس طرح چلاؤ۔ کُلّی اس طرح کرو۔ ہاتھ اس طرح دھوؤ۔ ڈکار اس طرح لو ـــــ فطرت کے معمولات تصنّعات کی زنجیروں میں باندھ دیئے گئے ـــــ کام آسان تھا۔ اس کو مشکل بنا دیا ـــــ واہ رے مذہب! مولانا فرمانے لگے۔ تیرا دماغ خراب ہے مذہب کو نہیں مانتا مگر عقل کو تو مان! میں نے کہا جناب! عورت مرد کی مملوکہ و مقبوضہ تھی۔ فطرت نے مرد کو اس کا مالک اور آقا بنایا تھا، آپ نے اتنے حقوق اس کو دے ڈالے کہ وہ مرد کے تفوق ہی سے منکر ہو چلی۔ آپ ہماری جائداد چھین رہے ہیں ـــــ ہم کو بے دخل کئے دے رہے ہیں اور پھر گنہگار بھی ہمیں کو ثابت کرتے ہیں۔ فطرت نے عورت کی قیمت صرف اتنی مقرر کی تھی کہ

بڑھا کر جو اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے

لیکن آپ نے مینا کو میخانے کا حصہ دار بنا دیا۔ وہ ہمارا کھلونا تھی۔ آپ نے اس کو ہماری ہستی کا "نصف" بنا دیا۔ واہ جناب واہ۔ پھر آپ چاہتے ہیں کہ ہم شکایت بھی

نہ کریں! مذہب نے مرد پر یہ ظلم ڈھایا کہ عورت کو اس سے چھین کر غلام کو آقا کے ہم پلہ بنا دیا۔ اور اب تو شدید حکم یہ ہے کہ اس کو نظر اٹھا کر بھی مت دیکھو! اس زبردستی کی پابندی کا نام آپ نے رکھا "زہد و تقویٰ"! یہ آپ کی قانونی اصطلاح ہے! میری ہی بلی اور مجھ ہی سے میاؤں! یہ حالت آپ نے مردوں کے مقابلہ میں عورتوں کی بنادی! ان کو حقوق دیئے گئے اور ہم سے چھینے گئے! آپ کی اس قانون سازی کو حضرت! دور ہی سے سلام! ——————

کوئی اور ہوتا میری جگہ تو مولانا اس کے سر پر عصا کھینچ مارتے۔ مگر میری باتوں کو وہ باؤلی سمجھا کرتے ہیں —— اس لئے اکثر اس قسم کی بحث اپنی عادت کے موافق حسب ذیل دلائل میں سے کسی ایک یا سب دلیلوں پر ختم کر دیا کرتے ہیں یعنی جس دن میں ان کو زیادہ نہیں گرماتا تو وہ محض "احمق، پاگل، خبطی" کہہ کر ٹال جاتے ہیں۔ لیکن جس دن ذرا حرارت آجاتی ہے تو "لاحول ولاقوۃ"، "توبہ توبہ!" "اللھم احفظنا" وغیرہ ان کا خاتمہ کلام ہوتا ہے اور جو بحث نے طول کھینچا اور مولانا کا پارہ بہت ہی زیادہ چڑھ گیا۔ تب تو "لعین، مردود، کافر" کی گرج اور کڑک پر گفتگو ختم ہوتی ہے —————— آدمی بہت اچھے ہیں مولانا، مگر ذرا شئے لطیف کم ہے!!

۲۹ ؍ مارچ ۔

رات بہت عرض معروض کے بعد غریب خانہ پر تشریف لائی تھیں ۔ مگر کچھ اداس اور افسردہ ، میں نے کہا تم کو یہ زیبا نہیں ، تم تو دنیا میں ہنسنے ہنسانے کے لئے بھیجی گئی ہو ۔ ان حسین آنکھوں کو آنسوؤں سے کیا علاقہ ؟ کہنے لگیں میرا پیشہ ہنسنا ہنسانا ہے ، مگر میری فطرت غمگین ہے ——— حسن ہمیشہ غمگین ہوتا ہے ——— اور عشق بھی ۔ ہوس البتہ خندہ بر لب ہوتی ہے ۔ اور گناہ قہقہے مارتا ہے ! ——— گناہ ! ——— لیجئے یہ بھی گناہ اور ثواب کے الجھیڑے میں الجھی ہوئی ہیں ! رات بہت دیر تک ان کو سمجھاتا رہا کہ گناہ اور ثواب کا تخیل انسانوں میں محض بزدلی اور مجہولیت کی نشانی ہے ۔ میں نے کہا زندگی کے جس نظم کی بنیاد تخویف اور تہدید پر ہوتی ہے وہ آزاد انسانوں کو غلام اور مجہول بنا دیتا ہے جب دل پر ڈر اور خوف کے نقوش ثبت کر دیئے گئے تو ضمیر کی آزادی ختم ہوئی ! اسی کا نام لوگوں نے مذہب رکھ دیا ہے ۔ کہنے لگیں مذہب کی تو میں بھی کچھ زیادہ قائل نہیں ، مگر رسم و رواج کے مطابق نماز بھی پڑھ لیتی ہوں ۔ کبھی روزے بھی رکھ لیتی ہوں مجھے تو مذہب سے شکوہ ہے کہ اُس نے مردوں کو عورتوں پر مسلط کر دیا ۔ یہ تم نے سچ کہا کہ خوف کی بنیاد پر جو تنظیم کی جاتی ہے وہ

انسانوں کی انسانیت کو مجہول اور مجبور بنا دیتی ہے۔ وہ نماز نماز کیا ہے جو دوزخ کے ڈر یا جنت کے مزوں کی امید میں پڑھی جائے۔ لوگ مذہب کی پابندی زیادہ تر دوسروں کو دکھانے اور مرعوب کرنے یا ملامت اور بدنامی کے خوف سے کرتے ہیں۔ یہ سب یا تو بزدل، جھوٹے اور مجہول ہیں یا مکار اور دنیا ساز،"

سیاہ اور گھنے ابرو پیشانی کی طرف کھچے ہوئے۔ بڑی بڑی غزالی آنکھیں معمول سے زیادہ کھلی ہوئی ——— اس طرح وہ گناہ اور ثواب کے فلسفہ کی تصریحات سے میری مدارات کر رہی تھیں، میں نے کہا ہم تم مذہب کے تخیل کی کجی کے متعلق تو متفق الرائے معلوم ہوتے ہیں، لیکن یہ تم نے کیا کہا کہ مذہب نے عورتوں پر مردوں کو مسلط کر دیا مجھے تو مذہب سے وجہ عداوت یہ ہے کہ اس نے مردوں کے مالکانہ حقوق چھین کر عورتوں کو ہمارے سر پر چڑھا دیا!! ہاں! کہنے لگیں، ہمارا تمام خون پی کر بھی آپ کو شکوہ ہے کہ ہڈیاں باقی رہ گئیں! مذہب کا نام لیکر آپ گویا ماتم کر رہے ہیں کہ عورتیں آپ کے قابو سے باہر ہو گئی ہیں۔ مذہب سے آپ صرف اس لئے خفا ہیں کہ اس نے آپ کی رعایا کو کچھ حقوق دیکر ان کے پاؤں کی زنجیروں کو قدرے ہلکا کر دیا ہے اور مجھے مذہب سے یہ شکایت ہے

کہ اس نے اپنے قانون کا ہم کو جبراً پابند بنا کر اس قابل نہیں رکھا کہ تم لوگوں سے کافی انتقام لے سکیں! عجب تماشہ ہے۔ ہم دونوں مذہب سے روگرداں ہیں لیکن دونوں کی روگردانی کے اسباب جدا جدا ہیں۔ اتحاد میں اختلاف! میں تو یہ کہتی ہوں ——— کہنے لگیں ——— کہ مرد اور عورت کے قضیہ کا مذہب کی عدالت میں فیصلہ ہی نہ کراؤ۔ اس قضیہ کو فطرت کی عدالت میں پیش کرو۔ مذہب کی قانونی اصطلاح میں گناہ اور ثواب کو گناہ اور ثواب ہی نہ سمجھو، آؤ ہم تم اپنے ضمیر اور اپنی عقل سے محاسبہ کریں، میں تمہیں بتاؤں کہ میں کیوں اپنے کو تم سے بہتر اور برتر سمجھتی ہوں، تم مکار اور بزدل ہو، میں نہ مکار ہوں نہ بزدل میرے اندر تم سے بہت کم مجہولیت ہے۔ میں ایک گندہ پیشہ کرتی ہوں لیکن اپنی، گندگی کو چھپاتی نہیں نہ اس کو پاکیزہ بنا کر دکھاتی ہوں۔ تم عیاشی کرتے ہو۔ مگر دنیا والوں سے ڈر کر مکاریاں اور حیلہ بازیاں بھی کرتے ہو۔ میں کھلم کھلا اپنے گھر پر بیٹھ کر اعلان عام کے ساتھ حسن فروشی کرتی ہوں مگر تم جب مجھے اپنے گھر بلاتے ہو تو رات کی تاریکی میں بند گاڑی کے اندر۔ برقعہ اڑھا کر۔ پھر مجھے لیکر بیٹھتے ہو تو گھر کے دروازے بند کرکے ——— تمہارے دل میں دنیا والوں کا خوف اور رسم و رواج کی غلامی موجود ہے۔ میں اس سے آزاد ہوں۔ اگر میرے

تمھارے تعلقات مذہب کی اصطلاح میں گناہ بھی ہیں تو تمھارا گناہ میرے گناہ سے بدرجہا بدتر ہے۔ اس لئے کہ اس میں بڑا حصہ مکر اور فریب کا ہے!——

ان ہی باتوں میں بلا مبالغہ ساری رات گزر گئی! کچھ عجب سی عورت ہے اس کی صورت میری حیوانیت کو مشتعل کرتی ہے۔ لیکن اس کی فلسفیانہ باتیں میرے دماغ کا گودا نکال لیتی ہیں——— مگر میں حسن صورت چاہتا ہوں میں مرد ہوں مجھے فلسفیانہ نکتہ نوازیوں سے کیا کام! میں جوان ہوں۔ دولتمند ہوں، آزاد اور مختار ہوں، بے پروا ہوں، وہ صرف ایک چھوکری ہے، حسین اور دلکش۔ میرے نفس کی پیش خدمت———

میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ آئندہ ملاقاتوں میں گفتگو کے اس پہلو کو درمیان ہی میں آنے ہی نہ دونگا——— میری ساری رات کیسی ضائع گئی——— چھوکری کس قدر چالاک ہے!———

۱۸ اپریل:-

اختر، محمود، ذکی، دانش، سب کے سب دن بھر جمے رہے۔ بستر سے اٹھنے بھی نہ پایا تھا کہ یہ غول کا غول وارد ہو گیا۔ برج جو شروع ہوا تو دوپہر کا کھانا بھی بھاگم بھاگ کھایا، پھر جو جمے تو رات کے نو بجے دم لیا۔ نہ سورج کے طلوع کی خبر

ہوئی نہ غروب کی! ہم سے بڑا بادشاہ کون؟ وقت بے حساب۔ فرصت بے شمار فکر صرف اتنی کہ دن میں چار دفعہ بھوک لگتی ہے۔ آفتاب نکلے یا غروب ہو جائے ـــــ ہمارے گھر کا چاکر ہے۔ اپنے وقت پر آتا ہے اور چلا جاتا ہے۔ ہمیں کچھ خبر نہیں۔ کہاں سے آیا اور کہاں گیا۔ جوانی! جوانی!! جوانی!!! میں تو کہتا ہوں کہ آدمی جوان ہی مر جایا کرے۔ جس دن محسوس ہو کہ عمر کا ضعف اعضا میں پیدا ہونے لگا۔ کچھ کھا کے سو رہے۔ دنیا کو ضرورت صرف جوانوں کی ہے۔ بڈھے تو مادر گیتی کے سینہ پر خواہ مخواہ پتھر کی طرح رکھے رہتے ہیں اسٹڈ میں بڈھے گھوڑوں کو گولی ماردی جاتی ہے۔ اس لئے کہ مفت کا دانہ چارہ کیوں دیا جائے۔ کوئی ایسا ہی اسٹڈ انسانوں کے لئے بھی بنایا جائے۔ جوانوں سے جوانی کے سارے کام لیجئے اور جب وہ بڈھے ہو چلیں تو ایک گولی کھلا کر کہیں توپ دیجئے، زندگی صرف جوانی ہے۔ بڑھاپا موت کے گھر کی چوکھٹ ہے۔ اس چوکھٹ پر پہنچ کر انسان کیسے کیسے بہانے کرتا ہے کہ کسی طرح چوکھٹ کے اس پار نہ جائے کیا کیا فکریں اور تدبیریں کرتا ہے، طبیبوں اور ڈاکٹروں سے رجوع کرتا ہے۔ مقویات اور مفرحات کھاتا ہے۔ بندر کی گلٹیاں اپنے جسم میں پیوست کراتا ہے ان کی معجونیں بنا بنا کر کھاتا ہے۔ موتی اور جواہرات گھول گھول کر پی جاتا ہے،

دنیا بھر میں بھاگا بھاگا پھرتا ہے۔ کس قدر بیوقوف ہے۔ جانتا ہے کہ ایک دن تو مرنا ہی ہے۔ شنبہ کو نہ سہی یکشنبہ کو سہی۔ مگر سانپ کی چھچھوندر بن کر کچھ دنوں موت کے حلق میں اٹکا رہنا چاہیئے۔ گدھا کہیں کا! جوانی ہے، مزے کرتا ہوں جب دیکھوں گا کہ رات کو جاگنے سے سر میں درد ہونے لگا۔ سمجھ لونگا کہ تیس مار خانی ہو چکی اپنا بوریا بستر سمیٹ کر موت کو آواز دونگا ——— "آجا! میں فارغ ہوں دنیا میں جو کچھ اچھا تھا اس سے میری جوانی نے اپنا حصہ ایک ایک رتی وصول کر لیا اب فرصت ہے محفل برخواست ہوگئی، آجا! اور جہاں تیرا جی چاہے مجھے لے جا!" اس طرح میں کھیلتے کھیلتے، پھولوں کی چادر پر ——— کسی مہ جبین کی آغوش میں ——— سو جاؤں گا ——— اس کے بعد کیا ہوگا؟ کچھ بھی ہو۔ مجھے کیا؟

مولانا خیر الزماں تو عاقبت کا دکھڑا لئے بیٹھے ہیں۔ واہ کیا زندگی ہے زندگی میں عاقبت کے خوف سے مرتے رہو۔ بڑھاپے میں موت کے ڈر سے پڑے کانپا کرو، اور جنت اور دوزخ کی فکروں میں بسورا کرو! ——— یہ بھی گویا جینے میں کوئی جینا ہے! ——— روتے ہی رہو، روتے جاؤ، پیٹتے جاؤ اپنے نصیبوں کو!!

۲۲ر اپریل۔

وہ مجھ سے خفا ہیں۔ شکایت یہ ہے کہ میں ان کے احباب کو رقیبانہ نظر سے دیکھتا ہوں! چاہتی یہ ہیں کہ ان کا فیض عام جاری رہے۔ وہ بہارِ حسن لٹائے جائیں اور میں بھی اپنا حصہ لیتا رہوں۔ بے چون وچرا۔ پرسوں جب وہ تشریف لائی تھیں تو میں نے ان سے اشارتاً کہا تھا کہ ان کے "دیگر احباب" کے تذکرے اور وہ بھی انہی کی زبان سے میرے لئے "فردوس گوش" نہیں ہیں ان کو میرے پاس بیٹھ کر اپنے احباب کے عشق والفت کی داستانوں کے بیان کرنے میں بہت مزہ آتا ہے میں نے کہا مجھے تو ان قصوں سے معاف رکھئے۔ مجھ سے التفات کیجئے اور دوسروں کی یاد کو گھر ہی چھوڑ آیا کیجئے —— اب بہت خفا ہیں کہتی ہیں تو میرے دوستوں کو اپنا رقیب بنا رہا ہے —— گویا کہ وہ میرے رقیب ہیں ہی نہیں،

عجیب ہے یہ عورت اور عجیب ہیں اس کی باتیں۔ ہدایت فرماتی ہیں کہ تجھے اپنے کام سے کام (تجھکو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو!) تو دوسروں کو دیکھ کر کیوں جلے! پھر ساتھ ہی ساتھ مردوں کی "حیوانیت" پر بھی لعن طعن۔ "لیلیٰ" کے بجائے کوئی دوسری "آرائش محفل" ہوتی تو میں کہتا کہ "حضور عالی! حسن کی فریب کاریوں پہ یہ غرور تمسخر انگیز ہے! مرد ہر حال میں مرد ہی ہے، شیر اپنے شکار میں جنگل کے دوسرے

رہنے والوں کو شریک نہیں کیا کرتا۔ سو دل کا قبضہ ہے اور قوت کا! — مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں بوڑھا ہو چلا! غصہ آتے ہی بگڑتا ہوں۔ تیار ہو کر بیٹھتا ہوں کہ آج آئیں تو ذرا مزاج پرسی کروں۔ جب وہ تشریف لاتی ہیں اور میں موم کی ناک کی طرح پگھل کر رہ جاتا ہوں! کبھی اپنی نسبت کچھ کہنا بھی شروع کیا تو وہ عجب طرح بھنویں اوپر کھینچ کر، آنکھیں نیم باز مسکراتی ہیں، اور کچھ ایسے انداز سے میرا مذاق بنانا شروع کرتی ہیں کہ زچ ہو کر رہ جاتا ہوں — "ہاں! تو آپ کے دل میں درد ہے! — آپ کے؟ — جی؟ رشک غیر نے آپ کا دل خراب کر ڈالا یہ عیاشی کرتے کرتے عشق کیسا شروع ہو گیا؟ مجاز سے حقیقت کی طرف پرواز! تصوف کا بہت بلند درجہ ہے۔ جناب! مگر سنئے تو۔ وہ سب بھی جن سے آپ خفا ہیں! اسی حال میں ہیں! مرتے ہیں! دیکھئے کس کس کا جنازہ اٹھاؤں۔ کس کس کو کفناؤں — اتنی بہت سی قبریں مجھ سے تو کھودی نہ جائینگی — زمین میں خریدے لیتی ہوں۔ قبریں اپنی اپنی سب کھدوالیں —" ایک دفعہ دل کے اندر ایک آگ سی لگتی ہے۔ دل کہتا ہے۔ اس عورت کی سزا یہ ہے کہ محض انتقاماً اس کو بیوی بنا کر گھر میں بند کر دیا جائے — یہ خوبرو تیتری اپنے رنگین پنکھوں پر کس قدر نازاں ہے" — پھر جو نظر اٹھا کر دیکھتا ہوں تو جیسے کسی نے

مُنہ پر ایک طمانچہ مار کر کہا "چپ - بے ادب!" —— پھر جب وہ چلی جاتی ہیں تو اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہوں - دل کہتا ہے "واہ حضرت! واہ معلوم شد بافندگی؟ آپ نے تو ہزاروں کے حسن کو فتح کیا، آپ کی عیاشی اور حسن پرستی کا تو ڈنکا بجتا ہے! آپ جوانمرد ہیں، آپ کا حق ہے کہ جس عورت کو چاہیں فتح کرلیں! اس عورت سے آپ کیوں پٹے جارہے ہیں" - اپنے اوپر لعنت بھیجتا ہوں اور پھر عہد کرتا ہوں کہ آئندہ ملاقات میں دو چار سخت جھٹکے دیکر دماغ درست کردوں گا! آئیں تو ابکی دفعہ! ساری تیزی طراری نہ بھلادوں تو لعنت ہے مجھ پر! —— کبھی سوچتا ہوں یہ عورت یوں قابو نہ آئیگی - بہت چالاک ہے لاؤ نکاح کرکے پابند کرلوں —— واللہ! جو کہیں مجھ سے نکاح کرلے تو ساری شاعری اور فلسفہ دھواں بن کر اڑ جائے! —— مگر نکاح کی پابندیاں —— میرے لئے؟ لاحول ولا، کوئی مرد پابند ہوتا ہے، جو وہ ہوجائینگے؟ دل اکتا گیا تو عورتوں کی کچھ کمی ہے، چار تک تو بیویاں ہی رکھی ہیں کون بیوقوف کہتا ہے کہ نکاح سے مرد پر بھی اخلاقی پابندیاں عاید ہوتی ہیں، نکاح تو صرف قبضہ مالکانہ کی شرعی توثیق ہے. جیسے جائداد خرید کر عدالت میں اس کی رجسٹری! قیمت نقد یا وعدہ اسی کا نام مہر ہے! ——

۲ر مئی۔

آخر چاہتی کیا ہے۔ یہ عورت؟ محبت کے نام سے بیزار ہے۔ زر پرست ہے نہیں، اس کی تعریف کرو تو چڑتی ہے ـــــ کس قدر سرد اور خشک ہے! اپنی عیش کی خلوتوں میں مجھے "سرد" عورت سے کس قدر نفرت ہے۔ ہر مرد کو ہوتی ہے۔ مرد عورت سے ہمیشہ اپنی حیوانیت کا جواب مانگتا ہے۔ عورت اگر بے حس ہو کر اس کی گود میں پڑی رہے تو پھر عیش کہاں۔ ایسی عورت سے تو بہتر مصوّروں کے شاہکار اور مرمر کے مجسّمے ہیں! انھیں کو دیکھ کر خوش وقت ہولیا کریں ـــــ اور ہزار شغل ہیں اور ہزار تفریحات ہیں! خوبصورت مُردے کو گود میں لیکر کیوں بیٹھے مرد کی اس سے بڑی توہین ہی کیا ہو سکتی ہے کہ وہ کسی عورت میں عیش کی گرمی بھی پیدا نہ کر سکے۔ وہ بربط نواز کیا جو ساز کے صحیح تاروں کو انگلی بھی نہ لگا سکے! ـــــ گزشتہ ہفتہ دو دن تک میرے پاس رہیں، میں نے لاکھ پوچھا کہ آپ کا یہ رنگ کیا ہے۔ ہنستی رہیں اور ہنستے ہی ہنستے دو آنسو بھی نکل پڑے۔ پھر ہنسنے لگیں! ـــــ مجھ پر عورت کے آنسوؤں کا کوئی اثر نہیں ہوتا، بلکہ صحبت عیش میں تو اس کے آنسو بے لطفی کا باعث ہو جاتے ہیں۔ مگر "لیلیٰ" کے وہ دو آنسو جو پرسوں میں نے اس کی آنکھوں سے گرتے دیکھے ـــــ ان کو اب تک نہیں بھول سکا ـــــ گویا وہ آنکھوں

سے نکل کر میرے دل میں اتر گئے ہیں!! ——— مجھے کیا ہو گیا ہے، لاحول ولا عورت کے آنسو دیکھ کر بیقرار ہو جانا ——— یہ بڑھاپا ہے یا بزدلی! یہی حال ہے تو بس ہو چکی حسن پرستی!!

صبح اختر آئے تھے۔ "لیلیٰ" اسی وقت رخصت ہوئی تھی، میں کچھ افسردہ سا پڑا تھا۔ اول تو اختر مذاق کرتا رہا پھر کہنے لگا "تم پھنس گئے ہو جبھی؟ اور مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بُرے پھنسے ہو" اس وقت میں نے بھی جو کچھ میرے دل میں تھا اختر سے کہدیا۔ اس نے بہت ہی سنجیدہ آواز میں کہا "میں تمہارا حال دیکھ رہا ہوں اس وقت سے دیکھ رہا ہوں جب سے "لیلیٰ" کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ اب ذرا سنبھل کر قدم بڑھانے یا ہٹانے کا وقت آیا ہے۔ اپنے نفس کا تجزیہ کر کے فیصلہ کرو کہ تمھارے جذبات محض عیّاشانہ ہیں جیسے کہ ہمیشہ ہوا کرتے ہیں یا کچھ آگے بڑھ گئے ہو اگر تم کو ذرا بھی شبہ ہو کہ تمھارے قدموں کے نیچے سطح ڈھالو ہے تو یہیں سے الٹے پاؤں لوٹ پڑو، ورنہ یاد رکھو مارے گئے۔ شکاری کتے کے دانتوں کی طرح عورت کے دانت بند ہو کر پھر کھلتے نہیں ہیں ساری شیخی کرکری ہو جائیگی۔ تمھارا دل اگر اس عورت کے متعلق واقعی بےچین ہونے لگا ہے تو کہیں نہ کہیں نکاح کر لو صرف یہی صورت بچاؤ کی ہے۔ تمھارے خاندان ہی میں حسین اور دولتمند لڑکیاں

موجود ہیں۔ عیاشی تو تم خوب کر چکے۔ مگر یہ پھندا بُرا ہے۔ سنتے ہو؟ یہ عورت کہیں تم کو گدھا بنا کر نہ چھوڑ دے ـــــــ اور خدا جانے وہ کیا کیا بکے گیا۔ میں نے سنا ہو تو لکھوں! گویا یہ سب سامان عاشقی فراہم ہو رہا ہے ـــــــ ہمارے لئے ـــــــ ایک ناصح مشفق بھی پیدا ہو گئے۔ ان کی بھی ضرورت تھی!!

۱۱ رمئی۔

اعلان الفت بغیر ارادہ کے ـــــ آنسو حتیٰ کہ ہچکیاں! عرض حال دل! بیتابی تمنا ـــــ غرض کہ کل رات بیٹھے بیٹھے بکھر گیا۔ یہ سب کیونکر ہوا کیسے ہوا ـــــ مجھے تو خبر نہیں ـــــ مگر تھی بہت طفلانہ حرکت! اپنے اوپر لعنت بھیج رہا ہوں وہ ہنستی رہی، میں روتا رہا ـــــ توبہ توبہ ـــــ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا! اس نے میری بینایوں کو بہت ہی تحقیر کی نظروں سے دیکھا۔ چلتے وقت تو وہ صاف کہہ گئی ـــــ مجھے اس کا ہر لفظ یاد ہے۔ "آپ اس وقت انسان نہیں بلکہ گدھے ہیں۔ عورت بازی کرتے کرتے عشق بازی کرنے چلے، میں تو اب آپ کے ساتھ رات بھر اس سینہ کوبی میں شریک ہونے کیلئے آنے سے رہی!"

۱۹ رمئی۔

بلاتا ہوں تو نہیں آتیں۔ ہار کر کل خود گیا۔ دروازہ بند کرالیا۔ میر صاحب

کو بھیجا تو ان سے کہا کہہ دیا کہ "جب تمھارا دماغ صحیح ہوگا تب آؤ نگی - ابھی تو چالیس دن تک سر پر برف کی تھیلیاں رکھے بیٹھے رہو!" ——————

ابھی اختر آئے تھے - مواعظ حسنہ کا ایک پشتارہ لیکر آئے تھے - خدا جانے کیا کیا بکتے رہے - کہنے لگے تم مرد ہو، تمھیں اپنی صنف کے تفوق کو کسی عورت کے مقابلہ میں اس قدر پست نہ کرنا چاہیئے اور عورت بھی ایسی ذلیل —— ایک ٹکے کی عورت —— سنتا رہا - سنتا رہا - وہ بکتے رہے بکتے رہے - آخر میں نے کہا کب تلک کوئی نہ بگڑے؟ حال بگڑا جائے ہے! پند و نصائح کے ذخائر تم سے زیادہ میرے پاس ہیں —— میاں اختر —— میں ایک بازاری عورت کے مقابلہ میں مفتوح اور بے بس ہو جانے کی ذلت کا بھی اندازہ کر سکتا ہوں! ——

جب وہ استہزا کرتی ہے اور مجھے ٹھکراتی ہے تو میرے قلب کے اندر وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے کہ گویا میں اپنی جان دیدونگا اور اس کی جان لیلونگا - —— پھر جب اپنے خشک ہونٹوں کو تر کر کے، اپنی مٹھیاں باندھ کر - سینہ نکال کر سبنھلتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ وہ میری اور میرے صنف کی جو توہین کر رہی ہے اس کا جواب دوں تو دفعتہً گویا ایک قسم کا فالج —— روحانی اور اخلاقی —— مجھ پر گرتا ہے - گونگا ہو جاتا ہوں —— وہ کہتی ہے —— سنتے ہو اختر؟ —— کہتی ہے - تم میں جو سب سے

زیادہ مردمی اور مردانگی کا مدعی ہوتا ہے۔ وہی سب سے بڑا نامرد اور بزدل ثابت ہوتا ہے۔" ——— کیا میں ان تیروں کی نوک کو اپنے قلب میں کھٹکتے محسوس نہیں کرتا ——— قسمیں کھاتا ہوں کہ آج کے بعد "لیلیٰ" کی صورت نہ دیکھونگا اور پھر صبح کو اسی کے ہاتھ جوڑتا ہوں کہ کل ضرور آنا۔ کچھ سمجھ سکتے ہو تم میری اس حالت کو؟ ——— میری عقل گم ہے ——— یہ کیا ہو گیا ——— آخر تمھیں بھی نہیں معلوم اور مجھے۔ ———

۵ رمئی۔

خطرہ سامنے آنے میں ہے، نظر ملانے میں ہے، میری آنکھیں سب سے زیادہ کمزور ہیں۔ وہ اس کو راستہ دیتی ہیں! اب وہ خفا ہے، میں بھی خاموش ہوں۔ شاید کچھ دن اس طرح گزر جائیں تو پھر میں اپنا توازن قائم کر لوں ——— آج کل شراب بہت پیتا ہوں، اپنی محفل میں عورتیں بہت سی جمع رکھتا ہوں، دن بھر قہقہے مارتا ہوں۔ خوب پینا ہوں، پیتے پیتے رات کو کسی وقت غافل سو جاتا ہوں۔ صبح کو اٹھکر پہلے صبوحی، پھر ناشتہ، اُڑا ہوا رنگ پھر جم جاتا ہے، بجلیاں پھر کوندنے لگتی ہیں ——— اس طرح

تم بھلائی جا رہی ہو، خبر ہے تم کو؟ ــــــــ کوئی میری محفل میں لیلیٰ کا نام نہیں لیتا۔ مَیں بھی نہیں لیتا ــــــــ زبانیں قاصر ہیں، دل میں پھر بھی وہ نام کھٹکتا ہے، جب کچھ کھٹک بڑھتی ہے ایک جام لبریز پی لیتا ہوں ــــــــ یہ جواب ہے تیری زبردستیوں کا ــــــــ او، بلائے بے درماں!! ــــــــ

۱۱ مئی۔

ہرن کو پکڑ کر لائے تھے، اصطبل میں باندھنے کے لئے ــــــــ وہ نہ بندھا ایک ہی جست میں رسیاں تڑا کر کہاں سے کہاں پہنچا! تیتری کو لائے تھے قفس میں بند کرنے ــــــــ وہ اپنے رنگین پر پھیلا کر صاف نکل گئی!! ــــــــ بچہ ہٹ کر رہا تھا کہ وہ آسمان کے ماہتاب کو پکڑ کر اپنی گود میں رکھ لے! اس کے ہاتھ پھیل کر رہ گئے! ــــــــ وہاں تک نہ پہونچ سکے ــــــــ زندگی کے نظم کو نہ توڑو، ہرن کو جنگل میں رہنے دو ــــــــ وہی اس کا وطن ہے ــــــــ تیتری کو شاخِ گل پر جھولنے دو ــــــــ وہی اس کا مسکن ہے ــــــــ چاند وہی رہے گا جہاں ہے بچہ سے کہو اس کو دیکھ کر تالیاں

بجائے اور ناچے، مگر اس کی طرف ہاتھ نہ بڑھائے ——— وہ بلند ہے اور بعید ہے! ——— میں اپنے دل کو تسکین دے لیتا ہوں، وہ عورت میرے لئے موزوں نہیں، اس کے حسن کی سنجیدگی میرے رندانہ عشق کی حریف نہیں ہو سکتی ——— جنس مختلف ہے، مذاق جداگانہ ہے، ہم نے ایک دوسرے کو تول لیا، وزن ایک نہیں!! پھر یہ ساری دردسری کیوں؟ ——— دل بہکاتا ہے عقل سمجھاتی ہے ——— میں شراب کی بوتل پر ہاتھ رکھ کر قسمیں کھاتا ہوں توبہ کرتا ہوں ——— شراب، جوانی، عیش اور حسن کے ہنگاموں میں جب کبھی تھوڑا وقفہ ہوتا ہے اور تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، تو پھر وہ یاد آجاتی ہے، عقل کہتی ہے، یہ تکلیف بھی چند روزہ ہے۔ گھبراؤ نہیں تو بھول جائے گا۔ ———

V. Good

۲۸ مئی۔

گئی ہوئی واپس آرہی ہے ——— عقل ——— گزشتہ غلطیوں کا نام تجربہ

ہے، حماقتوں کے بھنور میں پھنس تو گیا تھا مگر بچ گیا، میرا فلسفہ آڑے آیا۔ دوست احباب تو سر پیٹ ہی رہے تھے کہ ہائے گیا ہاتھ سے! مگر گناہ کی قوت ابھی مجھ میں باقی ہے۔ "بی لیلیٰ" روٹھ کر بیٹھ رہیں اور مجھے گرداب الفت سے نکلنے کا راستہ مل گیا، تم روٹھے ہم چھوٹے —— اپنی عیاشی اور حسن پرستی کی زندگی میں چند فلسفیانہ اور حکیمانہ اصول میرے رہنما رہے ہیں، ان کو اس روزنامچہ میں قلمبند کئے دیتا ہوں تاکہ میرے آئندہ پیدا ہونے والے فرزند کے اس وقت کام آئیں جب وہ جوان ہو کر عالم نسواں میں اپنے مجاہد باپ کی طرح فتوحات شروع کرے!

(۱) اپنے تمام افعال پر انسان کو ناز کرنا چاہئے، اور ان افعال میں جس قدر گناہ (بہ اصطلاح عام) کی آمیزش ہو اسی قدر ان کو زیادہ مایہ ناز سمجھے!

(۲) گناہ کی کھیتی دماغ ہے —— نہ دل نہ ضمیر —— اسی کو اپنے نفس کا رہنما بناؤ۔

(۳) معصوم اور گناہگار میں فرق صرف اتنا ہے کہ معصوم ایک بوسیدہ اور مردہ ماضی رکھتا ہے اور اسی کے دامن سے لپٹا پڑا رہتا ہے اور گناہگار ایک

وسیع مستقبل رکھتا ہے اور اسی کی طرف بڑھا چلا جاتا ہے!

(۴) عیاش کی روح بوڑھی پیدا ہوتی ہے مگر عمر کے ساتھ ساتھ جوان ہوتی جاتی ہے۔ جس قدر گناہ کرو اسی قدر روح جوان ہوتی جائیگی۔ البتہ جسم نوعمر اور جوان پیدا ہوتا ہے اور جس قدر زمانہ گزرتا ہے بوڑھا اور کمزور ہوتا جاتا ہے۔

(۵) "اخلاق" ایک بے معنی اصطلاح ہے۔ عیش جس کے اندر جنسیت کی لرزش حیات موجود ہو اصل حیات ہے۔

(۶) مرد کی زندگی میں عورت محض ایک ہندسہ ہے جس کی قیمت کے گھٹنے بڑھنے کا انحصار اس کا محل وقوع ہے۔

(۷) وسوسہ اور ترغیب کا علاج امتناع نہیں ہے، ارتکاب ہے۔

میری زندگی کے ایسے کتنے ہی روشن اصول میرا راستہ صاف رکھتے ہیں۔ میری اولاد کا راستہ بھی صاف رکھینگے، اور جو کوئی اس روزنامچہ کو پڑھیگا، اس کا بھی! اختر سے آج میں نے کہدیا کہ عشق کا تپ ولرزہ دو چار حملوں کے بعد ختم ہو گیا ہے۔ میں اب پھر ایک ہوشمند انسان ہوں اور حسن کا بے پرواہ ڈاکو! اختر خوش ہو گیا اس کا چہرہ دمک اٹھا، کہنے لگا، خوب بچے یار، بال بال بچے، لو آؤ ایک جام! بیاد رفتہ لیلیٰ!

۳ر جون۔

اتنی خفا ہوئیں کہ اس شہر سے بھی چلی گئیں، میر صاحب خبر لائے تھے۔ میں نے کہا میر صاحب جانے والوں کی خبر لاتے ہو۔ آنے والوں کی خبر لاؤ۔ کوئی نیا مال آیا ہو، کوئی نئی دکان کھلی ہو تو پتہ بتاؤ، رہیں لیلیٰ قسم کی عورتیں! —— تو انھیں تو یا عجائب خانہ میں رکھو کہ اہل نظر مطالعہ کیا کریں، یا جہاز کا ٹکٹ دلوا کر حج کے لئے روانہ کرادو! عمل کی دنیا میں اس قسم کی عورتوں کا وجود اہل کمال کو سرگردان کرتا ہے!

۶ر جون۔

زندگی نام ہے حرارت اور حرکت کا، سوال یہ ہے کہ اس حرارت اور حرکت کی استعداد کو تھوڑا تھوڑا خرچ کر کے زندگی کی مدت بڑھائی جائے! یا جلد اور زیادہ مقدار میں خرچ کر کے آمد اور خرچ کی میزان کو بعجلت برابر کر دیا جائے؟ چراغ کی بتی پنچی اور پتلی رکھی جائے تاکہ روشنی دیر تک (گو کہ کم) باقی رہے یا موٹی سی بتی ڈال کر اور جلدی جلدی اس کو بڑھا کر تیز روشنی کی جائے اور جو تیل دس راتوں کو کام دیتا اس کو ایک ہی شب میں خرچ کر ڈالا جائے؟ روشنی

کی تیزی زیادہ اچھی یا چراغ جلنے کی مدت کا طویل ہونا بہتر؟ جن کو اللہ میاں، کہا جاتا ہے انھوں نے تو انسان کو عجب مخمصہ میں پھنسا دیا ہے۔ یعنی یا تو ہلکی اور مدھم روشنی میں گھر کے نیم تاریک کونوں میں پڑے ٹٹولتے رہو اور اس طرح زیادہ عرصہ تک اندھیرے میں اپنا سانس جاری رکھو یا ایک ہی شب میں چراغ کو تیز جلا کر سارا گھر بقعہ نور بنا دو اور باقی سب راتیں بالکل اندھیری رکھو چراغ کے تیل کی مقدار مقررہ ہے۔ ازل کے کسی مشعل فروز نے ہر چراغ کو اس کے حصہ کا تیل ناپ تول کر دیدیا ہے۔ اس مقدار میں بیشی خارج از بحث ہے، خرچ کا اوسط البتہ، اگر تم چاہو تو کم و بیش ہو سکتا ہے! اب بتائیے درآمد پر قابو نہیں، برآمد ایک حد تک اختیاری ہے پھر کیا کیا جائے؟ ——— جوانی میں زندگی کی ساری پونجی پھونک ڈالئے ——— یا بڑھاپے کی انتہائی حد تک زندہ رہنے کے لئے اس پونجی کو حد درجہ کفایت شعاری اور جزرسی کے ساتھ خرچ کیجئے ——— ایک شب چراغ کی پوری روشنی سے شب کو دن کر لیجئے یا اس چراغ کو ستر اسی برس کی عمر تک ٹمٹمانے دیجئے ——— آندھیوں سے بچائیے، ہوا کے تیز جھونکوں سے محفوظ رکھئے ——— دامن کی آڑ میں، کسی کونے کے طاق میں، کسی فانوس کے

اندر، ——— ہر روز تیل اور بتی کا معاینہ کرتے رہیے۔ اب بتی اتنی باقی ہے۔ تیل اتنا ہے، ہوا تیز ہے، کہیں آندھی نہ آجائے۔ تیل نہ گر جائے۔ بتی خشک نہ ہو جائے ——————— ان، ترددات میں بدحواس رہیے، مگر زندہ رہیے ——————— سانس آپ کا چلتا رہے، یہ نہ رکنے پائے!!

مکان جب بوسیدہ ہو جائے۔ اس کی دیواریں جھک جائیں اس کی محرابوں میں شگاف پیدا ہونے لگیں، تو کیا یہ بہتر نہیں کہ اس کو گرا دیا جائے؟ یا یہ بہتر ہے کہ اسی کھنڈر میں پڑے رہیے اور اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہیے کہ آج یہ دیوار گری، کل وہ چھت بیٹھ گئی، یہ ستون ٹیڑھا ہو گیا ——— وہ بنیاد غرق ہونے لگی ——— روز اس عمارت کی تباہی کو پڑے دیکھتے رہیے۔ مگر ارادہ یہ رکھیے کہ جب تک دو اینٹیں بھی باقی ہیں، ہم تو اسی گھروندے میں لیٹے رہیں گے، تا آنکہ اس کی آخری دیوار کے نیچے دب کر رہ جائیں! ———

اس نقطہ پر پہونچکر جہاں سے جوانی کا انحطاط شروع اور بڑھاپے کا آغاز ہوتا ہے اس قسم کے سوالات ہم جیسے اہل بصیرت کے دلوں میں

پیدا ہوا کرتے ہیں، ان سوالوں کے جوابات تعداد میں اتنے ہی ہیں جتنے دنیا میں انسان، ہر شخص اپنے دماغ میں ایک جواب رکھتا ہے۔ لیکن میں تو کہتا ہوں، زندگی سے موت کا خطرہ نکال دیجئے! یہ تو اپنے اختیار میں نہیں کہ فنا کی شرط کو اپنی زندگی سے خارج کر دیں ——— ہوتا تو یہی کرتے ——— لیکن موت کے خطرہ کی تلخی کو زندگی کی حلاوت سے جدا کرنے کی یہ ترکیب تو کچھ مشکل نہیں کہ موت کے تمھارے قریب پہونچنے سے پہلے تم خود اس کے قریب پہنچ جاؤ! بجائے اس کے کہ وہ آئے اور اس کے آنے کے خطرے کے خیال میں تم اپنی جان گھلاؤ، تم ہی اس کے پاس چلے جاؤ! ———————
بے تکلف، ہنستے کھیلتے!! اس طرح زندگی کے نصف اجزا، کو تم موت کے خیال کی تلخیوں سے بچا لوگے پہلے اس سے کہ ڈاکوؤں کی جماعت تمھارے گھر پر دھاوا کرے، تم اپنی ساری دولت لٹا دو اور جب کچھ نہ رہے تو گھر کا دروازہ کھولکر پکارو۔ آ، لوٹنے والے! آ جا! لوٹ! کیا لوٹتا ہے؟ چھین کیا چھینتا ہے؟

یہ فلسفہ ایسی جوانی کا ہے جو بڑھاپے کی چٹان سے بندھا ہونا پسند نہیں کرتی، جو اپنے گلے میں بڑھاپے اور موت کے امکانات کا بھاری پتھر لٹکانا نہیں چاہتی زندہ رہو جب تک جوان رہو اور جب بڑھاپا اپنے آنے

کی اطلاع بھیجے تو دفعتاً مر جاؤ، فنا ہو جاؤ! یہ فلسفہ لوگوں کی سمجھ میں تو آتا ہے مگر وہ اس کو مانتے نہیں، یہ سب بدبخت اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ وہ بڑھاپے میں بھی کچھ نہ کچھ جوان رہنے کی کامیاب کوشش کر سکتے ہیں! پرانی تیلیوں پر ہر چھٹے مہینے نیا غلاف چڑھا کر گویا تیلیوں کو بھی نیا کر لیا جا سکتا ہے سونا کھائیں گے جواہرات گھول کر پی جائینگے، جسم کی رگوں میں سوئیاں بھونک بھونک محرک دوائیں پہونچائینگے تاکہ ان کے آغوش میں عورت ان کی گرفت کو کمزور محسوس نہ کرے، پوپلے مُنہ میں نئے دانت لگائینگے تاکہ ان کے بوسوں کا چٹخا جوانی کے بوسوں سے ملتا جلتا رہے! سفید بالوں پر خضاب کی استر کاری کرینگے تاکہ ۶۰ برس کی عمر میں عورت ان کو ۴۰ سے زیادہ کا نہ سمجھے۔ عمر دریافت کیجئے تو ہمیشہ ۵۰ کی بجائے ۳۰ بتائیں گے اور ۳۰ بتاتے ہوئے بھی شرمائیں گے۔ دل میں شکوہ کرینگے کہ کیوں ان کی اجازت کے بغیر عمر بڑھ جاتی ہے۔ جس قدر عورت اپنی عمر کو ظاہر کرتے گھبراتی ہے، اسی قدر وہ بوڑھا مرد بھی جو جوان بننے کی کوششوں میں مصروف رہتا ہو عمر کے متعلق کسی سوال کا جواب دیتے ہوئے گھبراتا ہے ——— یہ گھبراہٹ قبول، یہ شرمندگی قبول، یہ ضعف قبول، بڑھاپا قبول، مگر زندگی عزیز ——— مرتے ہیں

کہ کسی طرح موت کے آنے کو ملتوی کیا جا سکے ———— ! وہ آئے گی ضرور زندگی کے حقائق میں صرف وہی ایک ناقابل انکار حقیقت ہے! ————

———— سامنے سے میاں اختر چلے آرہے ہیں، چہرہ پر رونق ہے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ۔ رات اس بدمعاش نے ضرور کوئی نیا شکار مارا!

۱۱ رجون۔

کہتے ہیں کہ کل رات دو بجے زلزلہ آیا تھا۔ کئی جھٹکے محسوس کئے گئے شہر میں کچھ پرانے مکانات گر گئے، کچھ نئی دیواروں میں شگاف پیدا ہو گئے۔ دس بیس گھروں میں محرابیں شق ہو گئیں، ستون ٹیڑھے ہو گئے ———— آج کے اخبار سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مقامات پر چار پانچ ہزار آدمی ہلاک ہو گئے۔ ایک دو شہر ہی تباہ ہو گئے ———— بس اتنی سی بات کا ایک ہنگامہ برپا ہے! گویا کہ زلزلہ ایک بالکل نئی قسم کا واقعہ ہے جو انسان کی زندگی میں پہلے کبھی پیش نہ آیا تھا، ایک ایسا حادثہ ہے کہ اس جیسا پہلے نہ سنا گیا نہ دیکھا گیا۔ گویا کہ کل سے پہلے نہ کبھی کوئی دیوار گری تھی، نہ کوئی محراب شق ہوئی تھی، نہ کوئی مرا تھا! اور گویا چار پانچ ہزار آدمیوں کا مر جانا تو بالکل ہی عجیب واردات ہے جو آج تک کسی انسان

کے خیال وگمان میں بھی نہ آئی تھی !!

——— صبح ہی صبح میر صاحب دوڑے ہوئے آئے، ارے جناب! کل زلزلہ آیا، کیا قیامت کا زلزلہ تھا، اللھم احفظنا، کوئی جھٹکا آپنے بھی محسوس کیا؟ میں میر صاحب کی بدحواسی کو دیکھ کر ہنس پڑا۔ زلزلہ؟ زلزلے تو ہماری زندگی میں روز آتے رہتے ہیں، نئی کیا بات تھی میر صاحب؟ میر صاحب کی اور میری گفتگو بہت دلچسپ تھی، جو کچھ یاد ہے لکھتا ہوں۔

میر صاحب۔ کیوں حضرت آپنے بھی کوئی جھٹکا محسوس کیا؟

میں۔ جی ہاں! میں ٹھیک دو بجکر ۵ منٹ پر بوتل سے گلاس میں لوٹ رہا تھا، جھٹکا جو آیا چھلک گئی! اور وہ اس وقت میرے پاس تھیں وہ گھبرا کر میرے سینہ سے چپٹ گئیں، اور میں نے جو چھت کو ہلتے دیکھا تو میں سمجھا کہ آج آب گلرنگ ذرا تیز تھا اور میں نے میر صاحب جلدی سے ایک گلاس خالی کر کے دوسرا بھر لیا، میں نے کہا اگر چھت سر پر گر پڑی تو میں ایک آخری جرعہ سے کیوں محروم رہجاؤں، کیوں میر صاحب! یہ نہ کرتا تو کیا کرتا؟

میر صاحب۔ حضرت! مذاق تو چھوڑیئے، یہ کیا موقع ہے؟ ———

میں۔ مذاق؟ مذاق کیسا پیر صاحب؟ میری آپ کی گفتگو ہمیشہ سنجیدہ ہوتی ہے زلزلہ آیا، اس میں تو کلام نہیں، یہ اندیشہ بھی بجا نہ تھا کہ مکان گر پڑتا اور میں دب کر مر جاتا، بلکہ میرے ساتھ وہ بھی مر جاتیں جو اس وقت آرائش خلوت تھیں ان امکانات میں مذاق کی گنجائش کہاں؟ مگر ایسا ہو جاتا تو آئندہ کے بہت سے امکانات سے بہتر ہوتا، رات میں بچ گیا، اور اگر اسی طرح آئندہ زلزلوں سے بھی بچتا رہا تو بڑھاپا شروع ہو جائیگا صحت خراب ہونے لگے گی۔ زیادہ پیونگا تو سر میں درد ہوا کریگا، پھر گردوں میں درد ہوا کریگا۔ پھیپھڑے خراب ہو جائینگے جگر ماؤف ہو جائیگا۔ دس پانچ مہینے پلنگ پر پڑا رہونگا۔ اطبا اور ڈاکٹروں کا تختہ مشق بنونگا، آپ جیسے دوستوں کو تیمار داری کی تکلیفیں برداشت کرنی ہونگی —— ان مصیبتوں کے بعد مشکل سے مرونگا —— دس برس بعد جو کچھ ہونا ہے وہ رات ہی ہو جاتا —— ایک ہاتھ میں جام شراب ایک ہاتھ یار کی گردن میں، اوپر سے گرتی چھت —— صبح کو آپ سب احباب آکر پتھر، اینٹوں اور کڑیوں کے ڈھیر کے نیچے سے میرے کچلے ہوئے جسم کو نکالتے! ——————

پیر صاحب۔ توبہ توبہ! حضرت! آپ تو موت سے مذاق کرتے ہیں۔

میں ۔ مذاق وزاق نہیں میر صاحب! بات یہ ہے کہ جب مسافر کو اپنی منزل پر جانا ضرور ہو تو قریب کا راستہ کیوں نہ اختیار کرے دلی سے کلکتہ جانا ہو تو کشمیر ہو کر کیوں جائے! بھئی آپ کچھ ہی کہیں، میں تو یہی کہتا ہوں کہ رات بڑا اچھا موقع ہاتھ سے نکل گیا۔

میر صاحب ۔ لاحول ولا قوۃ، آپ بھی کیا باتیں کر رہے ہیں۔ ذرا غور تو کیجئے ملک کے ایک حصہ میں قیامت صغریٰ بپا ہے۔ ہزاروں بچے یتیم ہو گئے۔ ہزاروں عورتیں بیوہ ہو گئیں، ہزاروں انسان بے خانماں ہو گئے! ——

میں ۔ اجی میر صاحب! ذرا تو ٹھہریئے، آپ تو منہ اٹھائے بھاگے چلے جا رہے ہیں ذرا گام کھچے ہوئے! سوچتے نہیں کہے چلے جاتے ہیں، آپ تو ایسی باتیں کر رہے ہیں کہ گویا دنیا میں جو کچھ نہ ہونا تھا، کبھی نہ ہوا تھا، وہ سب ہو گیا۔ اے حضرت بچے تو سبھی یتیم ہوا کرتے ہیں۔ میں اور آپ، دو یتیم تو یہیں بیٹھے ہیں، عورتیں بھی سب کبھی نہ کبھی بیوہ ضرور ہوتی ہیں مکانات ویسے بھی مسمار ہوا ہی کرتے ہیں —— پھر نئی بات آپ کو کیا معلوم ہوئی رہا یہ امر کہ ہزارہا آدمی بےخانماں ہو گئے اور ہمدردی کے مستحق ہیں تو جناب اس دنیا میں کروڑوں انسان ہر لمحہ مبتلائے عذاب رہتے ہیں ان کروڑوں میں

اگر دس یا پانچ ہزار کا اضافہ ہو گیا تو آپ کی روح کیوں تحلیل ہونے لگی ؟ یہ تو ماں باپ کی غلطی ہے کہ بچے یتیم ہو گئے۔ انھوں نے پیدا ہی کیوں کئے، ــــ جو عورتیں بیوہ ہونے سے گھبرائیں وہ شادی ہی کیوں کریں، اور جو لوگ بے خانماں ہونے سے ڈریں وہ مکانات ہی کیوں بنائیں، جائیدادیں کیوں خریدیں، بستیاں اور شہر کیوں آباد کریں ــــــــ میر صاحب بیچارے کچھ نہ سمجھے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، کچھ بسورنے لگے، جب میر صاحب سے جواب بن نہیں پڑتا تو بسورنے لگا کرتے ہیں! میں نے کہا میر صاحب! یہ جو ہمدردی کا جذبہ انسان سے ظاہر ہوتا ہے اس کی حقیقت بھی کچھ آپ کو معلوم ہے یہ جذبہ درحقیقت خوشی اور اطمینان کا جذبہ ہے، اس کا تجزیہ کیجئے تو اس کے اندر بڑا عنصر خوشی اور اطمینان معلوم ہوگا (میر صاحب نے اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں خوب سکیڑ کر مجھے گھورنا شروع کیا) جب کوئی شخص کسی مصیبت زدہ کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتا ہے تو وہ گویا اپنے اطمینان و آسائش کے مقابلے میں اس شخص کی مصیبت کو دیکھتا ہے، اور اس امر سے مطمئن ہو کر کہ میں خود بعافیت ہوں کہتا ہے "افسوس زید کس قدر بیمار ہے۔" وہ ڈرتا ہے کہ کہیں وہ خود اس قدر بیمار نہ ہو جائے اور خوش ہے کہ اس کی یہ حالت نہیں!! کچھ نہیں میر صاحب یہ

ساری ہمدردی کچھ خوف ہے اور کچھ خود غرضی! کسی کو مرتے دیکھتے ہو تو زبان سے کہتے ہو کہ افسوس مر گیا بیچارہ، اور دل میں کہتے ہو کہ کہیں ہم نہ مر جائیں، شکر ہے کہ زندہ ہیں، بھئی فی الحال یہی غنیمت ہے کہ اسی کو موت آئی۔ ہم زندہ رہے، غنیمت ہے! یا جب کسی کو فقر و فاقہ میں مبتلا دیکھتے ہو تو کس قدر ہمدردانہ لہجے میں کہتے ہو، ہائے بیچارے پر کیسی مصیبت پڑی ہے، مگر اُس وقت تم اپنے بنک کے پاس بُک کی آخری میزان کا تصوّر کرتے ہوتے ہو اور تمہارا دل چپکے چپکے کہتا ہوتا ہے، شکر ہے، میرے پاس تو دولت کافی ہے۔ خدا نہ کرے میں فاقے کروں! تو میر صاحب قبلہ! ہمدردی ومدردی کو رکھئے بالائے طاق۔ جن کو مرنا تھا مر گئے۔ جن کو یتیم ہونا تھا ہو گئے۔ ہمارا آپ کا وقت آئیگا تو ہم بھی لٹھّے کا آدھا تھان لپیٹ کر قبر میں جا ئینگے، اور ممکن ہے کہ کفن بھی نصیب نہ ہو! آخر وہ ایسی بات کیا ہے جس کے لئے آپ اخباروں کا پلندا بغل میں ڈالے ہوئے، صبح ہی صبح میرے غریب خانے پر نازل ہو گئے اے جناب! زلزلے تو صبح سے شام تک آتے رہتے ہیں، یہ کیا ضرور ہے، کہ جب زمین ہلے جب ہی آپ کہیں کہ زلزلہ آیا؟ جب میں کسی حسین عورت کو دیکھتا ہوں تو زلزلہ آتا ہے۔ جب آپ کی سیدانی آپ کو ڈانٹتی ہیں تو زلزلہ آتا

ہے۔ جب میرے گھر کسی شب کو شراب کا گودام خالی ہو جاتا ہے تو زلزلہ آتا ہے
آپ کا بڑھاپا زلزلوں سے خالی نہیں، اور میری ساری جوانی زلزلوں سے معمور ہے
پھر اس اختلاج قلب کے کیا معنی؟ ——— بسورتے کیوں پھریئے،
افسوس کہ میر صاحب، تم پیتے نہیں، ورنہ ایک جام لبریز پیش کرتا، اور
کہتا کہ ہاں

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو

——— میں چھوٹی میز پر سے سگریٹ کا بکس اٹھانے مڑا اور پھر جو لوٹا
تو دیکھا میر صاحب معہ جوتیوں کے غایب ——— سیدھے محلہ کی
مسجد میں گئے ہونگے، نفل پڑھے ہونگے، توبہ کی ہو گی، میرے لئے ہدایت اور
نجات کی دعائیں مانگی ہونگی اور زلزلہ کا خیال آیا ہو گا تو رد بلا کا وظیفہ پڑھنے
بیٹھ گئے ہونگے ——— واہ میر صاحب، واہ ———

۱۴ ار جولائی ۔

ایک مہینہ بمبئی کی سیر و تفریح میں گذرا، چند پرزوں پر وہاں کے کچھ مشاہدات
لکھ لئے تھے۔ خدا جانے وہ پرچے کہاں پھینک دیئے، تھکا تھکایا گھر آیا ہوں،
سوچتا جاتا ہوں اور لکھتا جاتا ہوں۔ بہت سی باتیں یاد نہ رہیں خیر جو یاد ہیں اُن کو

تو لکھوں۔ ہر وہ بات جس کا تعلق عورت سے ہو مجھے عموماً یاد رہتی ہے، سوائے اس عورت کے، کہ عورتیں ہوں تعداد میں زیادہ اور ایک کی یاد دوسری کی یاد پر چڑھتی چلی جائے! ——— بمبئی کی سیر زیادہ تر طالبعلمانہ تھی، یعنی "فن کے متعلق" معلومات میں کافی اضافہ ہوا۔ حسن فروشی کی ادنیٰ دکانوں پر اور عامیانہ بازاروں میں، ان گلی کوچوں میں جہاں "شرفا" دن کے وقت نہیں جاتے مگر رات کو جانے میں کچھ حرج بھی نہیں سمجھتے، ہر جگہ عورت کی فطرت کا "مطالعہ" پر لطف بھی ہو سکتا ہے اور عبرت انگیز بھی۔ مجھے لطف سے کام ہے، عبرت کی آنکھ بند رکھتا ہوں۔ پھر بھی بمبئی کے اس بے تکلف اور بے حجاب طبقہ کی زندگی کا فلسفہ میرے لئے دلچسپ تھا۔ اس لئے کہ نیا تھا۔ پہلی دفعہ یہ تماشا میں نے دیکھا کہ سر بازار بلایا اور پکارا گیا ہوں، ہندوستان کی عورت مرد کے آگے بڑھنے کا انتظار کرتی ہے، مگر بمبئی کی یہ بین الاقوامی آبادی خود مردانہ وار آگے بڑھ کر مرد کو ٹوکتی ہے، کدھر چلے! ادھر آؤ۔ آپ ان کے دروازوں کے قریب سے گذریئے وہ عجیب عجیب آوازوں سے مختلف اور نئی نئی زبانوں میں آپ کو مخاطب کرتی ہیں جس وقت آپ ان کے "عیش کدہ" میں داخل ہوں "مائی ڈیر" اور "ڈارلنگ" کی بھرمار رہتی ہے۔ جب آپ کے دونوں پاؤں چوکھٹ کے اس طرف پہونچ گئے، تو پھر پہلا سوال ہوتا ہے "ہاؤ مچ؟"

فضولیات اور تمہیدات کی وہاں اجازت ہی نہیں، وقت بہت قیمتی ہے۔ حاشیہ کی عبارت بالکل نہیں، جو کچھ ہے متن ہی متن ہے! گاہک آئے، سودا خریدے اور جائے! با فضولی چہ کار! ــــــ ایک دن اتفاقاً ایک ذرا پڑھی لکھی، چھوکری مل گئیں، جب انھوں نے بھی خالص کاروباری انداز اختیار کیا تو میں نے ان سے کہا۔ "مس صاحبہ! مجھے تو آپ کی اس تاجرانہ ذہنیت سے گھن سی آتی ہے عورت و مرد کی یکجائی کا لطف مزے مزے کی باتوں اور دلچسپ گفت و شنید میں ہے۔ جسم کی کشش تو تعیش کا محض ایک جزو ہے، یہ نہیں کہ نانبائی کی دکان پر دو خمیری روٹیاں جس طرح بنا حلق سے اتاریں، دو گھونٹ پانی پیا اور دانت کریدتے ہوئے چل نکلے۔ تعیش کی لازمی شرط اطمینان اور فرصت ہے۔ عیش پسند کھانا بھی کھاتے ہیں تو دو گھنٹہ آہستہ آہستہ منہ چلانے میں صرف کرتے ہیں تاکہ ہر لقمہ کے پورے مزے سے ان کی زبان لطف اندوز ہو جائے اور ہر کھانے کے آب و نمک سے ان کے نفس کو زیادہ سے زیادہ ممکن وقت تک مسرور ہونے کا موقع ملے۔ عورت کی مجلس آرائی کا منشا بھی ہم لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ نفس کا "کیف" شراب کے نشہ کی طرح دیر تک قائم رہے! ــــ یہ سب سن کر وہ کہنے لگی۔ کس ملک کے جانور ہو؟ لطف صحبت میں وقت ضایع کریں تو پھر فاقے کیا کریں، تم جیسے آنے والے کوئی جاگیر یا

جائداد تو ہمارے نام لکھ نہیں جاتے ——— میں نے کہا، خفا کیوں ہوتی ہو!
مس صاحب، انسانوں کی طرح غصہ نہ کرو، تم انسان ہی کب ہو۔ تجارتی مشینیں
ہو! مشین کو غصہ نہیں آیا کرتا!" ہاں! ہم انسان نہیں!" اس نے کہا۔ "ہاں! ہم انسان
نہیں، مگر کس نے ہمیں حیوان بنایا؟ دوکاندار وہی مال تو دکان پر رکھتا ہے جس کے
گاہک آتے ہوں یہ نہ کرے تو دکان کیونکر چلے! تم حیوانوں کا جو کچھ مذاق ہے اسی کے مطابق
ہم اپنی دکان سجاتے ہیں۔ ایک دن میرے گھر بیٹھ کر تماشہ دیکھو، کیسے کیسے سیٹھ یہاں
آتے ہیں۔ میں کبھی بھول کر دو باتیں شروع کر دیتی ہوں تو بغلیں جھانکنے لگتے ہیں گھبرا کر
بھاگتے ہیں، تم "مجلس آرائی" کی توقع کرتے ہو اور حال یہ ہے کہ میرے خریدار اس طرح
میرے پاس آتے ہیں کہ گویا سگریٹ کی ایک ڈبیا خریدنے آئے تھے!" ———

ایک دن ایک مغربی "خاتون" سے ملاقات ہوئی۔ کہنے لگی ہمارے ملک میں
جس شغل کو تم محبت اور عیش کہتے ہو وہ بھی تجارتی زندگی کے سانچہ میں ڈھل گیا
ہے۔ بڑے سے بڑے سودے کم سے کم وقت میں طے ہوتے ہیں! ———

——— اصل سوال وقت کا ہے نہ مرد کے کام کا ہے نہ عورت کا! اور ہو
بھی کیا؟ ہر شخص مصروف اور عدیم الفرصت ہے! ایسی زندگی کے نظام اوقات
میں ہر شغل کے لئے نپا تلا وقت مقرر ہے، یہ نہ ہو تو مرد بھی فاقے کریں اور

ایک اور ملیں، ان سے میں نے پوچھا تم نے کبھی کسی مرد سے محبت بھی کی ہے۔ بیچاری میرا مُنہ تکنے لگی۔ "محبّت؟" اس نے کہا، میں تو دن رات میں چار چار مردوں سے "محبت" کرتی ہوں، جو کوئی میرے گھر آتا ہے اس سے محبت کرتی ہوں، تیرہ ۱۳ برس کی عمر میں یہ پیشہ اختیار کیا — اختیار کرایا گیا — اس وقت سے میں نے یہی سیکھا کہ ہر مرد جو آئے اس سے "محبّت" کرنی چاہئے۔ جب تک وہ ٹھہرے دس منٹ، دو گھنٹہ، یا دو مہینہ، میں نے کہا، عجب بیوقوف ہو، میں ایسی محبت کا ذکر نہیں کرتا، اصلی محبت، اصلی! ہنسنے لگی — کیا، محبت کی بھی قسمیں ہیں! اصلی بھی ہوتی ہے اور نقلی بھی؟ میں نے کہا بیوقوف چھوکری! وہ ہنستی رہی، لو صاحب یہ نئی بات سنی، محبّت کی بھی دو قسمیں! اصلی بھی اور نقلی بھی! جیسے میرا زیور، بہت سا نقلی ہے، اور کچھ اصلی ہے! آپ کے ملک میں دو قسم کی محبت ہوتی ہے۔ واہ سیٹھ صاحب واہ! خوب ہنسی، خوب ہنسی! میں بھی ہنسا۔ ہنستا نہ تو کیا کرتا۔ کچھ عبرت بھی ہوئی، شرم بھی آئی! پھر میں نے کہا، مجھے کیا۔ میں نے عورتوں کی ہمدردی کا ٹھیکہ تو لیا نہیں۔ جب وہ نہیں جانتی کہ محبت کیا ہے؟ تو اچھا ہے نہ جانے! —

۱۶ ر جولائی ۔

ایک دن بمبئی میں ایک صاحب بہت ہی گھبرائے ہوئے آئے، کہنے لگے سنا آپ نے؟ نجومیوں نے حساب لگا کر بتایا ہے کہ ۱۸ ر تاریخ کو پھر بہت بڑا زلزلہ آنے والا ہے۔ جس کا رخ زیادہ تر بمبئی کی طرف ہوگا، اب کیا کرنا چاہئے جناب؟ میں نے کہا غلطی تو آپ ہی لوگوں کی ہے۔ اب صلاح لینے سے کیا فائدہ؟ وہ کہنے لگے خدا کے لئے! ہماری کیا غلطی ہے؟ میں نے کہا۔ سارے مکانات آپ لوگوں نے زمین پر بنا ڈالے یہ غلطی کچھ کم ہے۔ اگر پہلے ہی یہ مکانوں کو زمین سے دو گز اوپر بناتے تو پھر زلزلہ آیا کرتا، زمین ہلا کرتی، آپ بےفکر رہتے! آخر مکانوں کو زمین سے چپکا کر بنانے ہی کی کیا ضرورت تھی؟ بیچارے سمجھے کہ میں نے کوئی پتہ کی بات کہی، سوچنے لگے، پھر دوسرے لوگوں کو مسکراتے دیکھ کر کچھ سمجھے، کہنے لگے۔ واہ صاحب! واہ! یہاں تو جان پر بن رہی ہے اور آپ کو "دلگی" سوجھی ہے!

جان بہت ہی قیمتی چیز سمجھی جاتی ہے، —— جان! حالانکہ وہ انسان کے وجود میں سب سے کم قیمت چیز ہے۔ جو چیز اپنی نہ ہو اپنے قابو کی نہ ہو اس کی قیمت ہی کیا؟ لیکن ایک دنیا ہے کہ اس "جان" کو اپنی "جان" سمجھ رہی ہے۔ باوجودیکہ یہ بھی خبر

نہیں کہ وہ ہے کیا، کہاں ہے، کہاں سے آتی ہے، کہاں جاتی ہے۔ جب وہ جانے لگتی ہے تو ایک لمحہ بھی آپ اس کو روک نہیں سکتے! پھر بھی وہ آپ کی ہے! —— سچ پوچھیے تو انسان کی جنس، کائنات میں احمق ترین جنس ہے سرتاپا احمق کامل! پھر اس پر اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ! دعویٰ دنیا کی خلافت اور حکومت کا! حالانکہ حکومت کا تو یہ حال ہے کہ اپنے ہی جسم کی ایک انگلی پر قابو نہیں، سائنس ہے، طب ہے۔ علوم عقلی و نقلی ہیں۔ کہیں کرہ ہوائی کو فتح کیا جا رہا ہے، کہیں سمندروں کی بادشاہت کا اعلان ہے۔ کہیں لوہے اور بجلی کے مصنوعی انسان بنائے جا رہے ہیں، کہیں کتوں اور خرگوشوں کو مار کر زندہ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ کوئی مریخ تک سفر کرنے کا تہیہ کر رہا ہے، کوئی انسان کی عمر طبعی میں اضافہ کرنے کی ترکیبوں پر غور کر رہا ہے! —— لیکن —— کرہ ہوائی اور سمندر کے بادشاہ سلامت اور مریخ کے مسافر سب کا دم پٹ سے نکل جاتا ہے اور لمبے لمبے لیٹ جاتے ہیں —— دیوانے بیوقوف، گدھے!!

۱۷ر جولائی۔

شام میاں اختر بہت ہی سنجیدہ صورت بنائے ہوئے آئے۔ مجھ سے

کہا کچھ مشورہ کرنا ہے، تخلیہ ہیں، ——— ان کی سنجیدہ صورت دیکھ کر میں تو سمجھا کسی نئی مہ پارہ کی خبر لائے ہونگے۔ لیکن وہ اپنی حماقت کا ایک نیا شگوفہ لے کر تشریف لائے تھے۔ کہنے لگے میری والدہ کی رائے ہے کہ میں شادی کرلوں تمہاری کیا رائے ہے؟ مَیں نے کہا معاف کرنا، اگر آپ کی والدہ یہ فرمائیں کہ میری (یعنی ان کی) یہ رائے ہے کہ میں (یعنی وہ) شادی کر کے اپنی بیوگی اور آپ کی یتیمی کا زمانہ ختم کردیں تو زیادہ مناسب ہوتا! مگر یہ کیا کہ شادی آپ کی اور رائے والدہ کی؟ دنیا میں انسان کو موت ایک دفعہ نہیں آتی۔ دو دفعہ آتی ہے۔ آدھا پہلی چوٹ میں مرتا ہے اور باقی آدھا دوسری چوٹ میں پہلی موت تو وہ ہوتی ہے جب اس نے ازدواج کی بیڑی اپنے پاؤں میں ڈالی سمجھئے کہ جوانی اور نصف زندگی کا خاتمہ ہو گیا ——— اور خاتمہ بھی بالخیر نہیں! شب عروسی سے بڑھاپے کا دور شروع ہوتا ہے۔ یعنی دوسری اور آخری موت کی تمہید! تم دیوانے تو نہیں ہو گئے کہ عین جوانی میں شادی! اپنی والدہ سے کہو، میرا بیاہ رچانا ہے تو کچھ دن اور زندہ رہیے، چالیس برس کی عمر ہو جائے، قویٰ ہونے لگیں سست، چلنے پھرنے اور اٹھنے بیٹھنے میں ہانپنے لگوں، تب وقت آئیگا کہ میرا سہرا تیار کیا جائے، ابھی تو ان باتوں کی نوبت نہیں!

کہا کیوں نہیں تم نے؟ اختر کہنے لگا کہ میری والدہ کہتی ہیں کہ تیری اولاد دیکھنے کی بہت تمنّا ہے اور زندگی کا اعتبار نہیں، —— زندگی کا اعتبار نہیں! یہ تو تمھاری والدہ کی بالکل جدید تحقیقات ہے، میاں اختر! ۸۰ برس اس دُنیا میں گذارنے کے بعد ان کو معلوم ہو گیا کہ زندگی کا اعتبار نہیں!! تمھاری والدہ تو لقمان کی والدہ سے کم نہیں، —— اب رہا اولاد کی تمنّا کا سوال، تو مردِ خدا صاف صاف کہہ کیوں نہیں دیتا کہ اولاد کی اب کیا کمی ہے جو اس کے لئے شادی کی جائے۔ تیرے کتنے ہی بچّے گلیوں میں مارے مارے پھر رہے ہونگے، ان میں سے ایک کو پکڑ کرلے جا اور دکھا دے۔ لو امّاں!، اولاد تو یہ موجود ہے —— میری جوانی کی محنتوں کا زندہ نتیجہ! دو چار پوتی پوتے ان کے حوالے کردے، بیٹھی پالا کریں —— اختر نے کہا تم اس وقت اپنی طبعی سنک میں ہو، جانے دو اس ذکر کو، میں نے کہا، یہ تو نہ ہوگا، تو نے اب ذکر چھیڑا ہے تو سُن! شادی کے متعلق تجھے میرے خیالات معلوم ہیں، اب میں کہتا جاؤں تو لکھتا جا! جا کر اپنی امّاں جان کو سنا دینا! ——

۸ ار جولائی —

کل جو اختر نے اپنی شادی کا ذکر چھیڑا، اور میں نے حضرت کی مزاج پرسی

شروع کی تو بھاگے، مگر میں کہاں جانے دیتا ہوں، پکڑ بٹھایا اور کہنی ان کہنی سب ہی کہی! کیسے فرمانبردار فرزند ہیں بیچارے! اماں کہتی ہیں بیاہ کرلے، سعادتمند کہتے ہیں، بہت خوب اماں! ـــــ اماں کہیں جا بیٹے کنوئیں میں ڈوب مر، یا تھوڑی سی سنکھیا کھالے، یا اپنی ناک کاٹ کر بازار میں نلاچ، تو بھی فرزند دلبند شفقت مادری کے جواب میں فرمانبرداری پر کمربستہ ہو جائینگے! واہ رے ہندوستان جنت نشان کے بیٹو اور واہ رے یہاں کی کالی کالی اماؤں!!

میں نے کہا، میاں اختر! جوانی میں بیاہ کرنا ایسا جیسے ہرن نے، اپنے پاؤں میں نعل ٹھکوا لئے، اور بڑھاپے میں ایسا جیسے بکرے کی داڑھی پر مہندی لگائی! آخر نکاح کا منشا کیا ہے؟ اگر منشا، افزائش نسل ہے تو یہ بغیر نکاح اور برات کے بھی ممکن ہے اور اگر منشا، "سماج" کا انضباط ہے تو وہ بھی "دو بول" پڑھ دینے پر منحصر نہیں، یہ سب باتیں تو اشخاص کی ذہنیت پر منحصر ہیں۔ اور ازدواجی پابندی تو اس قدیم عہد کی یادگار ہے جب دو انسان بیلوں کی طرح ایک مادہ کے لئے لڑتے تھے۔ جب معمولی خانگی ضروریات میں سے ایک عورت بھی تھی، لیکن اب تو ضرورتیں بدل گئی ہیں، ان ضرورتوں کو پورا کرنے والی اشیاء کی نوعیت بھی بدل گئی ہے اب اپنے گھر میں روشنی کرنے کیلئے کوئی

شخص نہ بازار سے تیل لاتا ہے نہ چراغ جلاتا ہے، بجلی کا ایک ہی تار سارے
شہر میں پھیلا ہوا ہے اور ہر شخص ایک بٹن دبا کر اپنی ضروریات رفع کر لیتا ہے،
زیادہ متمدن دنیا کے لوگ تو گھروں میں باورچی خانہ کا دھندا بھی ناپسند کرتے ہیں
بھوک لگی، سر راہ ہوٹل میں گئے، کھالیا۔ حقہ بھرنے، تازہ کرنے، سلگانے کا جھگڑا
ہی ختم ہو گیا، سگریٹ کی ڈبیا جیب میں ہے! ــــــــــــ رہا اولاد
کا سوال تو ــــ میں نے کہا ــــ بیوقوف! اگر تازے تازے پھل بازار
میں بکثرت میسّر آسکتے ہوں تو باغ لگانا۔ درختوں کا پرورش کرنا اور آبیاری
کی دردسری برداشت کرنا حماقت نہیں تو کیا ہے؟ پہلے لوگ مچھلیاں
پکڑنے دریا پر جاتے تھے۔ دن بھر کی سردی یا گرمی کی تکلیف اٹھاتے تھے،
تب رات کو ایک مچھلی پکڑ کر کھاتے تھے، اب پکڑی پکڑائی مچھلیاں، اچھی سے
اچھی، ٹین کے ڈبوں میں بند جہاں چاہو خرید لو اور کھالو، پھر جو تم دریا کے
کنارے بیٹھ کر اونگھو تو تم سے زیادہ گدھا کون؟ رہا غلّہ سو غلّہ یا پھل پیدا کرنے کیلئے
یہ کیا ضرور ہے کہ زمین کی زمینداری کے تمام حقوق بھی حاصل کئے جائیں!! ــــ
میں نے کہا ــــ اپنی اماں سے کہو کہ اماں جانی! غلطی یہ ہوئی کہ آپ اپنے زمانے
کے بعد بھی زندہ ہیں، قافلہ جا چکا، تم پیچھے رہ گئیں، اب دو وقت روٹی کھلائے

جاؤ اور دن گذارتی رہو۔ جس دریا میں تیر نہ سکو اس کے پانی سے دور ہی رہو!
—— درحقیقت انسانوں کی زندگی کی ٹریجڈی یہی ہے کہ ان کا زمانہ گذر جاتا ہے، ماحول بدل جاتا ہے، اور وہ باقی رہ جاتے ہیں، آخر عمر میں وہ تو پرانے ہوتے ہیں اور دنیا نئی، کہاں جائیں کیا کریں، کوئی ان کی بات نہیں سمجھتا، کوئی ان کو پہچانتا نہیں —— الو کی طرح کسی ویرانے میں بیٹھے اونگھا کرتے ہیں۔ نئی دنیا ان کی سمجھ میں آتی نہیں اور جب خواہ مخواہ وہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو لوگ ان پر ہنستے ہیں اور ان کی خاک سمجھ میں نہیں آتا کہ کیوں ہنستے ہیں!! —— میں نے کہا آخر "نکاح اور ازدواج کی پابندیاں عہد قدیم کی تاریکیوں کی یادگار ہیں، مہذب دنیا اب ان لغویات سے آزاد ہوتی جاتی ہے اور جنگ عظیم کے بعد تو عورت اور مرد کے جنسی اور اجتماعی تعلقات کا ایک بالکل نیا تجربہ روس میں کیا جا رہا ہے وہاں خانگی اور خاندانی پابندیاں یکسر مٹائی جا رہی ہیں اور زندگی کا سارا نقشہ بدلا جا رہا ہے۔ تم پڑھے لکھے نوجوان ہو، تم کو سمجھنا چاہئے کہ عہد جدید کے دروبست میں تمھاری اماں جان کا وجود محض بے ضرورت بلکہ ایک حد تک حارج اور مخل ہے۔ یہ مجبوری ہے کہ وہ زندہ ہیں اور زندہ رہنے پر اصرار کرتی ہیں، لیکن سانس لینے اور روٹی کھانے کے

علاوہ ان کے تمام حقوق ساقط ہو چکے، اس قسم کے ماں باپ اس زمانہ میں چھٹی انگلی یا
"اپنیڈی سائیس" کی طرح ہیں ——بیکار مگر موجود! —— اختر کہنے لگا، خدا
کے لئے اس لیکچر کو ختم کرو، میں نے کب کہا تھا کہ بیاہ کرتا ہوں، میں نے تو کہا تھا،
کہ اماں کا یہ خیال ہے —— مگر —— وہ کہنے لگا —— میں نے وہیں اس کی زبان پکڑی
اگر مگر کچھ نہیں! میں سمجھتا ہوں، تمھارے منتشر دماغ میں جو احمقانہ خیالات آرہے
ہیں! میاں بیوی کی الفت کے خواب اگر تم دیکھ رہے ہو تو یاد رکھو، میاں بیوی
صرف وہی خوش رہتے ہیں جن کے تعلقات میں اس اصطلاح کا دخل نہ ہو جس کو
محض اس لئے کہ کوئی دوسرا لغو تر لفظ میسر نہیں آتا —— "محبت"
کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ عورت اور مرد کے تعلقات اسی وقت
تک پر کیف ہوتے ہیں جب تک کہ ان دونوں کے درمیان نکاح کا واسطہ قائم نہ
ہو جائے!! —— اگر ایک دروازے سے قاضی صاحب نکاح پڑھانے تشریف
لائے ہیں تو یقین جانو کہ دوسرے دروازے سے سارا لطف زندگی نکل کر بھاگتا ہے!
دونوں ایک جگہ نہیں ٹھہر سکتے —— نکاح اور لطف زندگی! عورت جب تک خالص
عورت ہے اور مرد جب تک خالص مرد ہے —— نہ وہ بیوی ہے نہ یہ شوہر ——
—— اس وقت تک زندگی میں مزا ہے اور جب "قبول کیا میں نے اس کو" درمیان

میں آیا تو دو اچھے خاصے انسان میاں بیوی بن کر رہ گئے۔ خشک چڑچڑے، لڑاکا، بیمار، آزاری، یکساں بھنکتے ہوئے، منہ ٹیڑھے —— اختر کچھ گرما کر کہنے لگے جو منہ میں آئے بکے جاؤ، مگر ہمیں تو یاد ہے، ابھی دو تین ہی مہینہ ہوئے کہ تم "لیلیٰ" سے نکاح کرنے کے لئے مرے پھرتے تھے، اس وقت کہاں تھا، یہ فلسفہ اور کہاں تھیں یہ موشگافیاں؟ —— میں نے کہا —— عارضی دیوانگی قانون کا ایک مسلّمہ مسئلہ ہے، اس حالت میں لوگ خودکشی کر لیتے ہیں۔ قتل کر ڈالتے ہیں گالیاں دیتے ہیں، اینٹیں مارتے ہیں —— وہ سب عقل کا فتور ہے —— یہ کیا دلیل لائے تم! —— اختر ہنس کر کہنے لگا، اگر وہ دیوانگی کا دورہ تھا تو پھر بھی ہو سکتا ہے وہ دورہ! کسی دن دورہ پڑ گیا۔ ایک گھر والی گھر میں لا کر بٹھا دو گے، پھر ہم کریںگے ستر سلام! —— میں نے کہا بھاگ! اُلّو کہیں کا! ——

۲۹ جولائی۔

قدموں کی آہٹ پہچانتا ہوں —— مطلوب و مقصود جب اونچی ایڑی کی جوتیاں پہنے کھٹ کھٹ کرتا آتا ہے تو میں دور سے پہچان لیتا ہوں کہ یہ کھٹ کھٹ جانکی بائی کی ہے یا رادھا بائی کی، یا زیبن جان کی —— ! مگر جب قدموں کی آواز ہوتی ہے کھڑ۔ کھڑ، تو میرے اعصاب پر چوٹ لگتی

ہے اور متلی شروع ہو جاتی ہے ——— اب وہ آرہے ہیں ——— میز پر سے گلاس و لاس اٹھا کر پلنگ کے نیچے رکھ دیتا ہوں، کوئی بی صاحب جلوہ افروز ہوتی ہیں تو ان سے کہتا ہوں، تیک نخت ذرا دوسرے کمرے میں چلی جاؤ، اپنا پاندان بھی لیتی جاؤ، آب آمد تیمم برخاست ——— اس طرح وہ تشریف لاتے ہیں ——— مولانا خیر الزماں صاحب ——— جب وہ آتے ہیں تو میرا دل چاہتا ہے ——— کیا بتاؤں کیا چاہتا ہے! مولانا کھانستے، کھنکارتے، گلے کے بلغم کی ڈھیریاں سارے صحن میں اور سیڑھیوں پر جماتے پیک کی پچکاریاں مارتے، ڈاڑھی کھجاتے تشریف لاتے ہیں ——— السّلام علیکم ——— ابتدا اسی دعا سے ہوتی ہے ——— سلامتی ہو تم پر ———

مذہب، مذہب! مکر، مکر! مغرب ہو یا مشرق، زور، حیلہ، فریب، یہ سب ہماری زندگی کے جزو لاینفک ہو کر طبیعت ثانیہ ہو گئے ہیں۔ کچھ مذہب نے سکھایا کچھ تمدن نے، مگر اہل مذہب پر زیادہ الزام اس لئے کہ وہ صداقت اور ریا کی کے مدعی ہو کر مکر و زور کے مرتکب ہوتے ہیں "السّلام علیکم" کہتے ہیں اور اس کے ساتھ "ورحمتہ اللہ وبرکاتہ" بھی ——— مگر جو زبان سے کہتے ہیں ——— اس کے بالکل برخلاف دل میں ہوتا ہے

زید سے ملاقات ہوتی ہے، دل کہتا ہے مرجائے یہ شخص، تباہ ہو جائے مٹ جائے اور زبان کہتی ہے "سلامتی ہو تم پر" دل کہتا ہے اس کو زہر بھرا ایک پیالہ پلا دو، زبان کہتی ہے "عمرت دراز"! دل کہتا ہے، اس مردود کی بوٹیاں نوچو، زبان کہتی ہے "خدا سلامت رکھے" یہ حقیقت ہے اس پاکیزگی نفس اور خلوص قلب کی، جس کی تعریف مشرق میں مذہب اور مغرب میں "معلم اخلاق" دیتا ہے! دل کی بددعائیں زبان پر دعائیں بن کر آئیں اور زہر شربت کی، شکل میں پیش کیا جائے ———— اس کا نام ہے اخلاق حسنہ!!

ہمارے مولانا "السّلام علیکم" کہتے ہوئے آتے ہیں۔ اس لئے ان کو اپنے مدرسہ کے لئے مجھ سے چندہ لینا ہے، ہم "وعلیکم السلام" کہہ کر مصافحہ کرتے ہیں، اس لئے کہ ابھی تک مذہب اور عاقبت کا ایک بے معنی خوف ہمارے دلوں میں باقی ہے ———— عقل کہتی ہے کہ مذہب محض ایک ڈھونگ ہے مگر کمزور دل لرزتا ہے کہ جنت، دوزخ کی باتیں کہیں واقعی، صحیح نہ ہوں، کہیں مرنے کے بعد سچ مچ دوزخ کی کھڑکیاں قبر میں کھل جائیں، ہم سے تو وہی بیوقوف اچھے جو آنکھیں بند کر کے مذہب کی پیروی کرتے ہیں، یا وہ اچھے جو صاف صاف مذہب کے منکر ہیں، ان کو کچھ بھی،

نہیں تو ایک قسم کی یکسوئی تو حاصل ہے۔ ہم لوگ تو ادھر میں معلق ہیں ــــ نہ تیتر نہ بٹیر!! ــــــ اصل یہ ہے کہ انسانی زندگی کی ابتدائی سادگی اور پاکیزگی اتنے جالوں اور پھندوں میں پھنسا دی گئی ہے کہ ان جالوں کے کتنے ہی خلنے توڑ ڈالو پھر بھی پھندے باقی رہ جاتے ہیں۔ درسِ اخلاق سب مذاہب دیتے ہیں مگر مذہب والوں میں عمل کی توفیق کم پیدا ہوتی ہے ــــــ "وعلیکم السلام" مولانا تشریف لائے ــــــ میں نے کہا ــــ (دل کہتا تھا کہ یہ بیوقوف کیوں میرے اوقات کو خراب کرنے نازل ہو گیا) ــــ خیر حضرت مولانا تشریف لائے بیٹھے، دو تین پان مُنہ میں ٹھونسے، اگالدان کو بلغم سے بھرا، پھر کہنے لگے ــــــ کیوں میاں! کبھی تم نے تاریخ اسلام کا بھی مطالعہ کیا، نفسیات کے نقطۂ نظر سے؟ میں نے کہا جی ہاں، میں دنیا کی تمام بڑی اقوام کے نفسیات کا مطالعہ کر چکا ہوں۔ فرمایا، تم نے مُسلمان اور دیگر اقوام کی نفسیات میں کیا فرق پایا؟ میں نے کہا کچھ بھی نہیں! سب یکساں ہیں، جو عیب ایک میں ہے وہ باقی سب میں بھی ہے ــــــ کم وبیش ــــــ اشکال مختلف ہیں ــــــ ماہیت ایک ہے۔ کہنے لگے۔ ہائیں! پھر تم نے کیا خاک مطالعہ کیا؟ میاں اسلام کی تعلیم کو دیکھو اور دوسرے مذاہب کی تعلیم کو، زمین و آسمان کا فرق ہے! میں نے کہا

ہوگا، الفاظ مختلف ہیں، زبانیں مختلف ہیں، اسلوب بیان بھی مختلف ہے، مگر اچھی باتیں اور بُری باتیں سب مشترک ہیں اور ایک چیز سب ہی میں مشترک ہے کہنے لگے ——— وہ کیا؟ میں نے کہا وہ یہ کہ عمل خیر کی طاقت و استعداد کسی میں نہیں، مگر تصنع سب میں ہے، اچھی باتیں جو ہیں وہ بے اثر ہیں، بُری باتیں عام ہیں! پادری، راہب، اسقف، پنڈت، مولانا، لباس مگر سب کے جسم پر ہے دل میں کچھ ہی ہو عمل میں صحف سے اور تصنع! ان نفسیات کے متعلق میرا مطالعہ تو صرف اتنا ہے کہ سب کے سب نفس کے بندے ہیں ——— سوائے ان چند کے جو دنیا سے قطع تعلق کر کے ہمالیہ کے کسی غار میں منہ چھپائے پڑے ہوں ——— سو راستہ ان کا بھی صحیح نہیں۔ وہ گوشہ نشین معتکف ہم سے بھی سے زیادہ بزدل ہیں ——— دنیا کو سنبھال نہ سکے تو دم دبا کے بھاگے ——— مولانا کھانسے اجحت شروع کرنے سے پہلے کھانسا کرتے ہیں۔

بھائی میرے! ——— وہ بولے ——— پھر کیا تم دہریہ ہو گئے؟ لامذہب ہو گئے؟ میں نے کہا حضرت! نہ دہریہ ہوں نہ لامذہب، مسلمان ہوں بالکل ایسا ہی جیسے سب ہیں! ——— فرق صرف اتنا ہے کہ وہ کہتے نہیں، میں صاف کہتا ہوں، دونوں عیدوں کی نماز عیدگاہ میں پڑھتا ہوں۔ گائے کا گوشت کھاتا ہوں بہت

سخت قسم کا ہمدرد قوم ہوں، یعنی یہ حال ہے کہ قطب شمالی پر اگر کسی مسلمان بھائی کے اسلامی ناک میں ٹھنڈی ہوا گھس جاتی ہے تو مجھے اپنے آتشدان کے سامنے چھینکیں آنے لگتی ہیں! اگر ٹمبکٹو میں کسی مسلمان کا پاؤں پھسل جاتا ہے تو یہاں میرے جوتے میں ایک تکلیف دہ کیل نکل آتی ہے! مسلمانوں کو میں "خواب غفلت" سے بیدار کرنے کا اسلامی فرض بھی عنقریب انجام دینے والا ہوں ـــــ ذرا جوانی کے کاموں سے فارغ ہولوں، بڑھاپے کا گھنٹا بجتے ہی لیڈر قوم بن جاؤں گا، تمام مُردوں کو قبروں میں بیدار کردونگا۔ ـــــ مولانا بڑے ارادے ہیں میرے ـــــ پھر میں نے کہا ـــــ لفافہ خالی ہے مولانا، اس پر کیوں مہریں لگائی جا رہی ہیں ـــــ گھوڑا مُردہ ہے، ناحق آپ لوگ کوڑے مار رہے ہیں ـــــ روٹی کمائی کسی نہ کسی طرح، ـــ کچھ "کار خلوت" بھی کئے جائیے ـــــ چاہے مذہب کی آڑ میں چاہے ہم رندان بلاکش کی طرح ـــــ جب وقت آئے چلے جائیے ـــــ جہاں سے آئے تھے ـــــ معلوم نہیں کہاں سے آئے تھے ـــــ باقی سب جھگڑوں کو چھوڑیئے! ـــــ

مولانا نے گفتگو کا رخ بدلا، کہنے لگے، تم نے سنا شہر میں طاعون شروع ہو گیا ـــــ میں نے کہا الحمد للہ! پانچ سات برس میں جب ایک دفعہ حضور وائسرائے یا گورنر بہادر اس طرف آجاتے ہیں تب تو شہر کی سڑکیں درست ہو جاتی ہیں اور نالیاں

دُبل جاتی ہیں، اسی طرح دو چار برس میں جب طاعون آتا ہے تو شہر کی صفائی کا کچھ انتظام اور اہتمام ہو جاتا ہے، ان ہی دو کی وجہ سے شہر کی غلاظت کی مقدار کبھی کبھی کم ہوتی رہتی ہے! الحمد للہ نہ کہوں تو کیا کہوں، ـــــ مولانا کہنے لگے ـــــ

ـــــ میاں تم سے بات کوئی کیا کرے۔ الٹی کہتے ہو، سیدھی تو کہتے ہی نہیں اچھا یہ بتاؤ طاعون کا ٹیکہ لگوایا جائے یا نہیں؟ میں نے کہا، حضرت مولانا! اس زمانہ میں الٹی باتیں ہی سیدھی ہیں! سیدھی بات بیوقوفی کی بات ہے! ٹیکہ کی ضرورت آپکو بالکل نہیں مجھے ہے، کہنے لگے، یہ کیوں؟ میں نے کہا آپ پچاس کی عمر سے گذر چکے اور میں ابھی تیس کی منزل پر بھی نہیں پہنچا۔ آپکے انتقال سے دنیا کا کوئی نقصان نہو گا اور میں ابھی گاڑی کھینچنے کے قابل ہوں۔ فطرت کے تقاضوں کو پورا کر سکتا ہوں مجھے کچھ روز ٹھہرنے دیجئے، آپ آگے جایئے، دراصل ہم اور آپ فطرت کے رازوں سے واقف نہیں، وہ وقتاً فوقتاً وباؤں، طوفانوں، زلزلوں اور جنگ و جدل کے ذریعہ سے گھر کی صفائی کرتی رہتی ہے۔ اس کے جھاڑو میں جس قدر خاشاک آجاتی ہے اسکو اپنے کوڑہ گھر میں پھینکدیتی ہے اس جھاڑو کا مقابلہ زمین پر پھیلے ہوئے تنکے نہیں کر سکتے۔ طاعون ایک بہت معمولی اصطلاح ہے، اس سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ دو چار دن کا بخار اور گلٹیوں کا درد اس سے تو بہتر ہے کہ ستر برس کی عمر میں آپ ذیابطیس گنٹھیا

ضیق النفس سیلسل البول اور خدا جانے کتنی بلاؤں میں گرفتار ہو کر ایڑیاں رگڑیں اور آپ کے اہل وعیال تیمار داری کرتے کرتے پریشان ہو جائیں، دوست احباب عیادت کرتے کرتے تنگ آجائیں۔ اطبا نسخے لکھتے لکھتے تھک جائیں اور بڑی مشکل سے آپ کی روانگی کا وقت آئے —— بیل گاڑی کا سفر کیوں کیجئے جبکہ آپ ایکسپریس یا طوفان میل میں سوار ہو کر جا سکتے ہیں!! ——

ہمارے مولانا ہنس دیئے، میں بھی ہنس دیا —— پھر وہ اپنے بچے کچوں کا ذکر کرنے لگے، یہ تذکرہ ان کو بہت عزیز ہے اور ماشاءاللہ بچوں کے متعلق مولانا کا نظام الاوقات بھی بہت مرتب اور منظم ہے، ہر گیارہویں مہینہ کے شروع اور آخر میں ۴۳ کروڑ میں ایک کا اضافہ مولانا کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور اس میں کبھی تاخیر نہیں ہوتی، نیکبخت ملانی جی مولانا سے اس معاملہ میں پورا تعاون کر رہی ہیں۔ دیکھئے کب تک مولانا کا یہ خیر جاریہ قائم رہتا ہے! ——

بچے مولانا کے سب بہت حسین ہیں —— کوئی کانا، کوئی کالا، کوئی بہرا کوئی لنجا! —— مگر مولانا کو اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ ان کے بعد وہ سب اسی خاندانی مسند رشد و ہدایت پر جلوس کرینگے اور جب تک جبہ و عمامہ کا اثر لوگوں کے دلوں میں باقی ہے ایک آنکھ، یا ایک ٹانگ، یا دو ٹانگ کا کوئی سوال

پیدا ہی نہیں ہوتا! اللہ کے خالص بندے فانی اور جسمانی حسن صورت کے محتاج، کب ہوتے ہیں! اپنے خیال میں مولانا اسلام کی ایک بڑی خدمت انجام دے رہے ہیں اور یہی کافی ہے ——— غرض یہ کہ مولانا نے دوپہر کا کھانا میرے ساتھ کھایا، جب میں ستار لیکر بیٹھا اور مولانا سے کہا کہ سنیئے کوئی گت تو وہ لاحول پڑھتے ہوئے اٹھ گئے۔

۹ راگست۔

پرسوں رات، کل رات، گذشتہ رات، تین دن مسلسل اس دنیا میں نہ تھا جو اخلاق و آداب اور احتیاط و اعتدال کی دنیا ہے۔ بلکہ اس دنیا میں تھا جہاں احتیاط اور اعتدال عیب ہے۔ جہاں نہ ماضی ہے نہ استقبال، حسن ہے، عیش ہے اور حال ہے! آج ذرا پلنگ پر پڑا ہوا تکان دور کر رہا ہوں! ———

کاش کہ عیاشی میں تکان ہوا ہی نہ کرتی۔ ان تین راتوں کا خمار ہنوز سر میں ہے اور تصوّر کا دامن ہاتھ میں، ایک عورت پھر میرے اندر ایک تازہ "طلب" پیدا کر رہی ہے ——— کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے! میں ابھی پڑا ہوا سوچ رہا تھا کہ اگر میرے ساتھ حسن کی آویزشوں کا سلسلہ "لیلے" کے واقعات کے بعد بھی جاری رہ سکتا ہے ——— تو پھر اس کے یہ معنی ہو سکتے

ہیں کہ "لیلیٰ" کے متعلق میری وارفتگی جس کو میں اس وقت محبّت سمجھتا تھا طلب عیش کے چڑھے ہوئے دریا کی صرف ایک موج تھی ـــــ اور کچھ بھی نہیں۔ کیا میں دھوکہ کھا رہا تھا جب یہ سمجھتا تھا کہ اس عورت نے پہلی مرتبہ میرے قلب پر محبت کی خاتم سلیمانی ثبت کی ہے اور وہ چیز مجھے دیدی ہے جس کو اہل دل "عشق و محبت" کہتے ہیں! دنیا کا ہر کوتاہ نظر ظاہر پرست یہی کہے گا کہ میری حُسن پرستی کا یہ مسلسل دور ہوس کا ایک ہنگامہ ہے۔ ہر بندرہ دن میں ایک نئی عورت کی طلب اصطلاحی طور پر ہوس ہی ہوس کہی جاتی ہے۔ مگر میں نے اس نکتہ کو بالکل دوسری طرح حل کیا ہے۔

انسانیت کا وہ جوہر لطیف۔ وہ "برقیت" ــــ محبت ـــــ ہر عیاش اور رند کے قلب میں موجود ہے اور عورت بہ عورت منتقل ہوتی رہتی ہے یعنی ہر عورت جو اس عیاش کے آغوش میں آتی ہے ایک شب یا چند روز کیلئے اس "برقیت" کی حامل رہتی ہے پھر جب مرد کسی دوسری عورت کی طرف مائل ہوتا ہے تو وہ برقیت بھی اسی طرف منتقل ہو جاتی ہے ـــــ اور اسی طرح منتقل ہوتی رہتی ہے ـــــ عورت بہ عورت ـــــ منزلیں طے کرتی ہوئی وہ "برقیت" آخر اس عورت تک پہنچتی ہے جو اُسکی مقصود ہے اور وہیں مرکوز ہو کر رہ جاتی ہے ـــــ وہ اپنی آخری منزل پر پہونچنے کے لئے بہت سی منزلیں طے کرتی

ہے ! پس یہ کہنا کہ ایک ہوس پرست عیّاش نورِ محبّت سے محروم ہے اور اس کے آغوش میں جو عورتیں آتی ہیں وہ بھی محروم رہتی ہیں صحیح نہیں۔ اصل یہ ہے کہ وہ سب کچھ روزمرہ کی محبت سے تھوڑا بہت حصہ پاتی ہیں، مگر ہاں، ان کے وجود میں وہ محبت قیام نہیں کرتی ——— گذرتی رہتی ہے ——— تا آنکہ آخری عورت تک پہونچے ——— میری وہ آخری عورت کون ہوگی، معلوم نہیں ——— یا وہ آخری عورت "لیلیٰ" ہے (یادش بخیر) جس کی طرف میں پھر لوٹنے والا ہوں؟ ——— معلوم نہیں! اور یہ بھی تو ممکن ہے کہ آخر کار میرے اس دریا کا سارا بہاؤ کسی ریگستان میں جاکر خشک ہوجائے، گم ہوجائے، ختم ہوجائے، اور میری "برقیت" کی یہ لہر کسی آخری نقطہ تک پہونچنے ہی نہ پائے!! ——— ابھی تو یہ لفافہ ڈاک میں ہے ——— گذر رہا ہے ——— ایک تھیلی سے دوسری تھیلی میں، ایک ڈاکخانہ سے دوسرے ڈاکخانہ میں!! ———

ایک دن اختر کو میں نے اپنی عیاشی کا یہ فلسفہ سنایا، وہ کہنے لگا:۔ ——— پڑھا لکھا پاپی اپنے پاپ کی توجیہہ و تاویل خوب کر لیتا ہے۔ مجھے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا یہ لفافہ ڈاک میں چلتے چلتے یونہی لاپتہ

ہوجائے گا! کوئی ڈاکیہ کسی نالی میں پھینک دے گا، وہ نالی اس لفافہ کو بہا کر چہ بچہ میں لے جائیگی، کوئی خاکروب چہ بچہ سے نکال کر اُس کو کھاد میں شامل کردے گا! ——— نور محبت کی شعاعیں بڑھاپے کی ظلمت میں فنا ہوجائینگی! ——— یا یہ "برقیت" اس طرح عورتوں میں تقسیم ہوتے ہوتے ختم ہوجائے گی، بارود گیلی، آتش خانہ سرد!! زندہ رہے تو ——— وہ کہنے لگا ——— ہم دیکھ لینگے کہ جب گناہ کی طاقت باقی نہ رہے گی تو توبہ توبہ کروگے، کسی نیک بخت لڑکی کو شریک زندگی بنالوگے اور ممکن ہے کہ آخر عمر کی کمزور کوششیں ایک دو بچے بھی پیدا کرلیں ——— آپ بیٹھے ہوئے اونگھا کرینگے اور اپنے باپ دادا کی طرح اونگھتے ہی اونگھتے کسی دن چار آدمیوں کے کندھوں پر سوار ہوجائیں گے ——— کہاں کی "برقیت" اور کہاں کا نور محبت!! میں نے کہا، میاں اختر! تم جوان بھی ہو! عیاش بھی ہو، یہ سب باتیں اچھی ہیں مگر تمھیں اس فن کی "عرفانیات" سے ذوق نہیں! اس کا افسوس ہے! تمھارے نزدیک انسان کی زندگی کا ایک نظام مکمل و مرتب ہے! ——— پیدا ہوگا، جوان ہوگا، عیاشی کریگا، بڈھا ہونے لگیگا، توبہ کرے گا، پھر ایک بیوی،

مہیّا کرے گا، ایک دو بچے پیدا کر ڈالیگا، آخری عمر میں اللہ اللہ کریگا ——
اور مر جائیگا! تم سمجھتے ہو کہ انسان کی زندگی میں اس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ حالانکہ
واقعہ یہ ہے کہ انسان کی نفسیاتی زندگی کا دستور العمل نہ کبھی مرتب ہوا نہ ہو سکتا ہے
انتشار اور اختلال ہی اس کی زندگی کی ترتیب و ترکیب ہے —— یہ تصویر ایسی نہیں کہ
اس کو کسی چوکھٹے میں لگایا جا سکے۔ وہ چوکھٹے اور فریم میں سماتی ہی نہیں سب
کی دنیا ایک نہیں، جتنے انسان ہیں اتنی ہی دنیائیں ہیں، ہر انسان بجائے خود
ایک دنیا ہے، وہ اپنی دنیا اپنے دل و دماغ میں لئے پھرتا ہے۔ پیدائش اور
موت کے سوا دو انسانوں میں کوئی چیز مشترک نہیں، اور یہ دو چیزیں جو مشترک
ہیں نہایت خفیف اور معمولی ہیں —— جس طرح کتاب کے شروع اور آخر کا
سادہ ورق شمار میں آتا ہے پڑھا نہیں جاتا! زندگی کے ان دو معمولی حادثوں
سے قطع نظر کر لو تو پھر کوئی انسان کسی حیثیت سے دوسرے انسان کا شریک
یا مثل نہیں ہوتا —— البتہ —— میں نے کہا —— جذبہ —— یعنی شہوت،
محبت، غصہ، رنج وغیرہ اس جنس کا ایک مشترک عنصر کہا جا سکتا ہے لیکن
اس کی کارفرمائیوں اور مظاہروں کو دیکھو تو وہ بھی بالکل الگ الگ ہیں!
ہر وجدان اور کیفیت جدا جدا ہے —— کیف اور "طلب" مختلف ہے، جب تجالی ہو تو

انسان کی زندگی کا کوئی مشترک دستور العمل کیونکر مرتب کر سکتے ہو۔ لوگ سوانحِ عمریاں لکھتے ہیں، تذکرے لکھتے ہیں، سو دو سو، چار سو صفحوں میں گویا ایک انسان کی زندگی کا بہت سا حال لکھ جاتے ہیں ـــــ تاریخوں کے چند سو یا چند ہزار صفحات پر قوموں اور انسانوں کی بڑی بڑی داستانیں بیان کی جاتی ہیں ـــــ گویا چھاپہ خانہ کی سیاہی اور کاغذی کے کاغذ سے عہدِ ماضی کی تاریکیوں میں چراغ روشن کر رہے ہیں!! مگر ـــــ میں نے کہا ـــــ آخر، کیا حقیقت ہے ان سوانحِ عمریوں تاریخوں اور تذکروں کی؟ لفافے کے ظاہری نقش و نگار بیان کئے جاتے ہیں! لیکن لفافہ کے اندر نفسیاتِ انسانی کی جو تجلیات بیقرار رہتی ہیں ان تک سوانح نگار اور مورخ کا خیال اور قلم کبھی نہیں پہنچ پاتا! کسی ایک فردِ واحد کی معنوی زندگی کے ہجوم میں گھس کر اس کے خصائص کو ایک ایک کر کے میدان میں لانا چاہو تو کیا لا سکو گے؟ خود اپنے اوپر یا مجھ پر تجربہ کر کے دیکھو! یا فرض کرو زید کی معنوی زندگی کے کچھ نقوش قلمبند کرنا چاہتے ہو، اس کی ہر خصوصیت کے لئے ایک ایک باب مخصوص کر دو۔

زید جب وہ جھوٹ بولتا ہے۔

زید جب وہ شراب پیتا ہے۔

زیدؔ جب وہ نماز پڑھتا ہے۔

زیدؔ جب وہ چوری کرتا ہے۔

زیدؔ جب وہ عورت کے قریب ہوتا ہے۔

زیدؔ جب وہ دوستوں سے ملتا ہے۔ وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ

اس میں صرف ایک ہی جزو کو لے لو یعنی "زید جب وہ جھوٹ بولتا ہے۔" قلم میں کچھ زور ہے اور زیدؔ کے متعلق کچھ بصیرت بھی ہے تو حقیقت حال لکھنا شروع کرو۔ کتنے جھوٹ زید نے بولے، کہاں کہاں، کس کس سے، اور کیوں؟ کتنے جھوٹ زید نے ایسے بولے جس سے دوسرے لوگوں کو شدید نقصانات پہنچے، کتنے ایسے بولے جن کا منشا، اپنی عیب پوشی تھی، کتنے بے وجہ عادتاً بولے، کتنے عورت پر قبضہ کرنے کے لئے اور کتنے اپنی بیوی کو دھوکا دینے کے لئے اور کتنے اپنی اولاد کو بہکانے کے لئے؟ ہر دفعہ، جھوٹ بولتے وقت زیدؔ کے محسوسات کیا تھے، جذبات کیا تھے، کتنی دفعہ وہ جھوٹ بول کر پشیمان ہوا۔ اُس کے کتنے جھوٹ کامیاب رہے کتنے ناکام! ——— وغیرہ، وغیرہ، وغیرہ،

ساری عمر اس ایک ہی باب کے لکھنے میں ختم ہو جائیگی، اس محشرِ انتشار کا

جس کو انسان کہتے ہیں، دستور العمل کیا بنا سکتے ہو؟ دلّی کا فیلسوف شاعر، خوب کہہ گیا ہے ؎

ہے آدمی بجائے خود اک محشر خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہو

اس محشر خیال میں تم جیسے غوطے کھاتے ہیں اور جو اس انتشار کے متعلق کچھ بصیرت رکھتے ہیں ——— میری طرح ——— وہ ہنستے بولتے گذر جاتے ہیں! میں دوسروں کی "انجمن" کے تلاش کرنے میں کیوں اپنی جان گھلاؤں؟ ——— میری اپنی خلوت میری اپنی انجمن ہے! ہر انسان اپنے ساتھ ایک ایسی انجمن لئے پھرتا ہے ——— کون اس کی سوانحعمری لکھ سکے، کون اس کی معنوی زندگی کا لاکھواں حصّہ بھی بیان کر سکے؟ سب کو اپنی اپنی راہ جانے دو، تم بھی بڑھے جاؤ ——— البتہ اتنا کام کیجیو کہ اگر راستہ میں کوئی حسین عورت نظر آجائے تو اس کو سمجھا دینا کہ ان کا (یعنی میرا) گھر اس طرف ہے!! بات یہ ہے کہ میرے "انوار محبّت" جن کی حامل فی الحال پرسوں رات والی ہے عنقریب کسی اور طرف منتقل ہونا چاہینگے!! ——— اختر ہنستا ہوا اور کہتا ہوا چلا گیا ——— ٹھیر جا! تو اور تیرا "نور محبت" لاتا ہوں بلا کے

مولانا خیر الزماں صاحب کو!!

۱۴ اگست ۔

"گناہ کر، پکّا پاپی بن جا، رات دن کا فرق بھول جا، اور سر
کو مستی سے بھاری کر کے خانہ خدا میں لڑکھڑاتا ہوا جا ——
بھوکے کتّے" کو اپنے دروازہ سے لات مار کر بھگا دے اور لمبی
لمبی ڈکاریں لیکر نرم بستر پر سو جا! ——"

ایک روسی شاعر کی نظم کا یہ ترجمہ میں رات بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ اس کم بخت نے اس قدر خوشگوار نظم کے آغاز کا انجام وطن پرستی کے جذبہ کو قرار دیا ہے اس نے انسانی زندگی کے کیف تمام کی ایسی اچھی تصویر کھینچنی شروع کی!! سارے خطوط صحیح اور متناسب —— مگر آخر میں آسمان سے گرا سیدھا وطن پرستی کے چہ بچّہ میں! لاحول ولا! میرے استاد نے ایک دن خوب کہا تھا —— مر گئے بیچارے! اس لئے کہ خوب کہنے والے اکثر جلد مر جاتے ہیں —— خوب کہا تھا انھوں نے! کہنے لگے کہ ان تمام مذاہب کے پیرو اور علمبردار جو توحید کے مدعی اور شرک کے دشمن کہے جاتے ہیں خود بدترین قسم کے بُت پرست ہیں،

کعبہ کے بتوں کو تو انھوں نے گرا دیا سومنات کے بتوں کو بھی توڑ ڈالا۔ مگر ان مٹی اور پتھر کے مجسّموں سے زیادہ خونخوار بتوں کی پوجا شروع کردی! اُن ہی میں سے ایک وطن پرستی اور قوم پرستی ہے۔ انسان اپنی زندگی کے بُرے سے بُرے جذبہ کو وطن پرستی کا لباس پہنا کر نچاتا ہے۔ جن چیزوں کو اس نے اپنے اخلاقی دستور العمل میں بُرا اور معیوب قرار دیا ہے (میں تو خیر اس دستور العمل کا، قائل ہی نہیں) ان سب کو وطن پرستی کے پردہ میں روا رکھتا ہے۔ میں جو کام کرتا ہوں ——— کارہائے خلوت ——— وہی سب بلکہ ان سے زیادہ وطن پرست کرتا ہے مگر اپنی وطن پرستی کا نام لیکر۔ میں عیاشی کرتا ہوں، مگر زمین کے قبضہ اور ملکیت کے لئے کسی کا گلا نہیں کاٹتا، وہ ایک گز زمین کیلئے فوجوں کی صفیں آراستہ کرکے ہزاروں لاکھوں انسانوں کو بھیڑ بکریوں کی طرح، کاٹ ڈالتا ہے اور کٹوا دیتا ہے۔ میں عورت بازی کرتا ہوں ——— بغیر شرمائے اور چھپائے ہوئے ——— وہ بہانہ بازیاں کرکے، مکر اور فریب سے عورتوں کو بیوہ اور بچّوں کو یتیم کرتا ہے، پھر اپنے کو دنیا کا محسن اور محافظ قرار دیتا ہے۔ میں زنا کرتا ہوں۔ اس عورت کے ساتھ جو میرا پیسہ لے کر، یا بغیر اس کے مجھے ایسا کرنے کی اجازت دیتی ہے۔ مگر وہ دوسری قوموں کے گھروں پر بغیر اُن

کی اجازت کے قبضہ کر لیتا ہے اور پھر مفتوح اگر اس کو ڈاکو کہے تو بغاوت کا مقدمہ چلاتا ہے! میں شراب پی کر اپنے یار کو پیار کرتا ہوں۔ وہ سپاہیوں کو شراب پلا کر درندہ بناتا ہے ——— اس کے عیش کے دن میری عیش کی راتوں سے بہت مختلف ہیں! زندہ باد وطن! پائندہ باد وطن!! ———

میری تو کبھی سمجھ ہی میں نہ آیا کہ دنیا کے لوگ کیونکر ان پُرفریب، اصطلاحوں سے دھوکہ کھاتے ہیں۔ جہاں ایک حسین عورت پاس ہو، ایک صراحی شراب کی سامنے ہو ——— وہیں میرا وطن ہے۔ مگر وطن پرست کا وطن وہ ہے جس کے لئے وہ دوسروں کی عورتوں اور دوسروں کی شرابوں کو چھین لائے! ———

میں روزانہ ایک دو اخبار پڑھ لیتا ہوں۔ لیکن طلاق کے مقدمات کی روئیدادیں پڑھتا ہوں۔ سینما اور تھیئٹر کے اشتہارات پڑھتا ہوں، حسن و عشق کا کوئی قصہ ہو تو وہ پڑھتا ہوں، مگر جب اس مطالعہ کے سلسلے میں کوئی سُرخی نظر سے گذرتی ہے جیسے:-

"جاپان میں وبا۔"

"امریکہ میں سونے کے ذخائر کی کمی۔"

"رومانیہ میں بغاوت"۔

"اسپین میں دستوری حکومت"۔

"فرانس کی مجلس وزراء کا استعفا"

تو صرف سُرخی پڑھ کر گذر جاتا ہوں، کبھی ان لغویات میں اپنا وقت ضایع نہیں کرتا! اگر فرانس کی وزارت نے استعفیٰ دیدیا یا اگر رومانیہ میں بغاوت ہو گئی، یا اگر امریکہ میں سونے کے ذخائر کی مقدار کم ہو گئی تو میں نے کیا قصور کیا ہے کہ میں اس آدھے یا سوا کالم کے پڑھنے میں اپنا وقت ضایع کرنے پر مجبور کیا جاؤں اگر "لیلیٰ" کے ہم جنسوں نے اپنے پیشہ سے استعفیٰ نہیں دیا، تو مجھے کیا پرواہ ہے اگر سارے یورپ کے وزرائے اعظم استعفیٰ دیدیں!! اگر وہسکی کے کارخانوں میں کافی وہسکی تیار ہو رہی ہے تو پھر امریکہ میں سونے کی مقدار کے کم ہو جانے سے مجھے کیا غرض؟ اگر ہندوستان میں کوئی ایسی بیماری نہیں ہے، جس کے جراثیم کا زہر قاطع باہ ہو تو پھر جاپان کی وبا کے حالات پڑھ پڑھ کر میں کیوں ماتم کرنے لگوں؟ دنیا کے سارے وطن پرستوں کو میرے مقابلہ میں لے آؤ، سب کو ہارنا پڑیگا! ——— میری دلیل بہت قوی ہے، ——— لاجواب ہے۔ بڑے بڑے منطقی دوستوں کی زبان بند کر دیتا ہوں۔

دیسی ہو یا بدیسی —— !! عورت اور مینا ئے مے —— وہ آخری مُحبّت ہے مجھُے تو وطن پرستی، قوم پرستی، تہذیب تمدن اور اسی قسم کی تمام بیماریوں سے محفوظ رکھتی ہے —— عورت اور مینائے مے !! اُس بیوقوف روسی شاعر کا قلم میرے ہاتھ میں ہوتا تو میں —— یوں اس کی نظم کو ختم کرتا۔

"گناہ کر، پکّا پاپی ہو جا، رات دن کا فرق بھول جا،
—— بھوکے کُتّے کو اپنے دروازے سے
لات مار کر بھگا دے اور لمبی لمبی ڈکاریں لے کر نرم بستر
پر سو جا —— صبح کو اگر روس کی زمین پر امریکہ کا جھنڈا
نصب ہو جائے تو ووڈکا کے بجائے بیئر پینی شروع کر دے
اور اگر انگلستان کا قبضہ ہو جائے تو وہسکی پی۔ فرانس قابض
ہو جائے تو انگوری پی، اور اگر مہاتما گاندھی کا چرخہ
چلنے لگے تو سیندھی پی ٹھرّا پی —— اور یاد رکھ
—— اخبار کبھی نہ پڑھ۔"

۱۶ اگست۔

لاکھوں برس پہلے، جب ہنوز انسان جنگلوں میں ننگا پھرتا تھا ــــــ

کیا اچھے تھے وہ دن ــــــ جب وہ درختوں پر اور غاروں میں زندگی بسر کرتا تھا، ایک دن اس کی صحرائی آبادی میں ایک انسان درخت کی بلند شاخ سے نیچے کیچڑ میں گر پڑا۔ اس کے دوسرے ساتھی دوسری شاخوں پر جھول رہے تھے اس کو کیچڑ میں سنا ہوا دیکھ کر خوب ہنسے ان میں سے ایک ہنستے ہنستے بے قابو ہو کر خود بھی اسی طرح کیچڑ میں گرا، ہنسنا بھول گیا، چوٹ بھی لگی، کیچڑ میں لت پت ہو گیا، منہ پھلائے ہوئے اٹھا اور صحرائی چشمہ کی طرف چل دیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ چشمہ کے پانی سے اپنا بدن صاف کرے مگر کنارہ پر پہونچکر اس چشمہ کے شفاف پانی میں دفعتاً اس کو اپنا عکس نظر آیا ــــــ کیچڑ میں لت پت، منہ سنا ہوا، ہاتھ پاؤں لتھڑے ہوئے، ناک پر مٹی کا ایک تودا چپکا ہوا ــــــ ہیئت کذائی نہایت تمسخر انگیز ــــــ وہ پانی پر اپنے اس عکس کو دیکھ کر بے اختیار ہنس پڑا۔ باوجود چوٹ کی تکلیف کے اس کو اپنے حال پر ہنسی آ گئی ــــــ اس وقت پہلی دفعہ انسان نے جرأت مردانہ کی بہترین مثال پیش کی ــــــ یہ جرأت

کہ اپنی چوٹ اور اپنے دکھ پر ہنس دے!! آج بھی لاکھوں برس بعد وہی انسان مرد ہے جو تکلیف دہ چیزوں کے تمسخر انگیز پہلو بھی دیکھ سکے، اپنی مصیبتوں میں تبسّم آفریں جزئیات کا پتہ پالے، اپنی تکلیف میں مسکرانے کا موقع نکال لے!!

—— یہ قصہ مجھے اس لئے یاد آیا کہ اختر نے آج صبح معترضانہ کہا تھا کہ تم کبھی سنجیدہ نہیں ہوتے اور موقعہ اور بے موقعہ ہی ہی ہاہا کرتے رہتے ہو، واقعہ یہ ہوا کہ میاں اختر اپنی ایک معشوقہ کے مکان پر تشریف لے گئے۔ اس کے دروازے کے قریب ہی سامنے سے اپنے چچا میاں کو آتے دیکھ کر ایسے گھبرائے کہ دروازے میں گھس گئے وہاں تھا اندھیرا اور راستہ میں پڑا تھا ایک تخت، ٹھوکر کھا کر گرے تو ناک پر چوٹ آئی، جھنجھلائے ہوئے اندر پہونچے تو مسماۃ کسی دوسرے چاہنے والے کے ساتھ تخلیہ فرما رہی تھیں۔ جلے بھنے میرے پاس آئے، میں نے شروع کیا مذاق! بالکل آگ ہو گئے —— اصل یہ ہے کہ اپنی حماقت کے تکلیف دہ نتائج پر خود ہی ہنسنا ہے بہت مشکل کام اور جو لوگ ایسا کر سکتے ہیں ان کی اخلاقی سطح درحقیقت بہت بلند ہوتی ہے —— میاں اختر ابھی کچے ہیں!

۱۹ر اگست۔

خانہ بدوش ـــــــ آوارہ گرد ـــــــ وہ سب ہیں جو انسان اور آدمی کے نام سے پہچانے جاتے ہیں، ایک ویرانہ ہے، یہ دنیا۔ زندگی ایک لمبی سڑک ہے جو نہ معلوم کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں ختم ہوتی ہے۔ ایک انبوہ کثیر ہے جس میں ہم سب ایک دوسرے کو دھکے دیتے۔ کہنیاں مارتے، کچلتے، روندتے، گرتے پڑتے، دوڑتے یا لنگڑاتے چلے جارہے ہیں، خراب و خستہ ـــــــ اس کا نام زندگی ہے!! کسی ستم ظریف خالق نے ہمیں اپنا کھلونا بنایا ہے ـــــــ گدھے بنائے ہیں اور ان سے کھیل رہا ہے۔ کسی کا کان اینٹھ دیا، کسی کی ٹانگ توڑ دی، کسی کی دم کھینچ لی، کسی پر پتھر اور کسی پر جواہرات لاد دیئے۔ کسی کو اتنا کھلا دیا کہ اس کا پیٹ پھٹ گیا اور کسی فاقہ زدہ کے منہ کا نوالا بھی چھین لیا ـــــــ یہ سب گدھے دوڑے دوڑے پھر رہے ہیں ـــــــ کدھر ہے؟ کہاں ہے؟ کون ہے؟ کوئی مسجد کے مینارے پر چڑھ کر پکارنے لگا۔ کسی نے مندر میں گھنٹے بجانے شروع کر دیئے، کوئی کتابوں کے ورق الٹنے لگا ـــــــ بحثیں چھڑ گئیں، یہ نہیں وہ ہے، وہ نہیں یہ ہے! خدا ایسا ہوتا ہے، ایسا نہیں ہوتا۔ بیچ میں کوئی صاحب بول اٹھے۔ ہوتا

بھی ہے ہے بھی؟ پھر سب طرف سے بھونک شروع ہو گئی، پنجوں اور دانتو ں سے لڑنے لگے۔ گلے کی رگیں پھول گئیں، مُنہ سے کف گرنے لگا —— گوشت خر دندان سگ!! نتیجہ؟ نتیجہ سب یکساں —— یوں ہی لڑتے لڑتے مر گئے —— اور مرنے کے بعد؟ کسی نے کہا جنت اور حوریں، شہد کی نہریں اور دودھ بھرا حوض! کسی نے کہا شکتی اور مکتی، کسی نے کہا آواگون —— معلوم کسی بیوقوف کو کچھ نہیں! اللہ اللہ کرنے والے بھی گئے، رام رام کرنے والے بھی مرے، خاک میں دبائے گئے یا آگ میں جلائے گئے —— باقی کوئی نہ بچا اور اللہ اگر کوئی ہے تو وہ وہیں کا وہیں رہا جہاں تھا، مرتے رہو، مٹتے رہو روتے رہو، لبسورتے رہو —— مختار نہیں ہو، مجبور رہو، اس ساری زندگی میں جو موت سے زیادہ غمناک اور دوزخ کی آگ سے زیادہ جلانے والی ہے شعریت اور بہار کا کوئی پہلو ہے تو وہ صرف عورت ہے اور اس کیلئے مرد کی طلب"! مگر قیامت ہے کہ روشنی کی اس ذراسی شعاع کو بھی مذہب والے مٹائے ڈالتے ہیں، آنکھیں نیچی رکھو، تاکو مت، آنکھ سے آنکھ نہ ملاؤ، ہاتھ سے ہاتھ مس نہ کرو! پھر یہ دھمکیاں کہ ہاتھ کاٹ ڈالے جائینگے، آنکھیں پھوڑ دی جائینگی۔ دوزخ کے سُرخ دہکتے ہوئے انگارے حلق میں ٹھونسے جائیں گے

ستّر ہزار برس مبتلائے عذاب رکھّے جاؤ گے، ستّر ہزار کوڑے مارے جائیں گے، ستّر ہزار سانپ تمھارے جسم سے لپٹیں گے، ستّر ہزار بچھّو تمھارے ڈنک ماریں گے ______ تنگ آگیا ہوں، تنگ آگیا ہوں، اِس

تمام جبر و قہر سے، میں اس ذلیل محکومیت اور جابرانہ تخویف سے اپنی آزادی کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں، پکار کر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میں کسی کا محکوم نہیں، صرف حُسنِ ازل کا غلام ہوں، اور اگر خدا بھی حُسنِ ازل ہے تو مجھے اُس کی خدائی سے انکار نہیں، مگر یہ نہ ہو گا کہ جبر و قہر اور تخویف و تعذیر میری فطرت کے تقاضوں کو دبا سکے۔ حسن کی غلامی عین آزادی ہے، جس طرح ایک قطرہ پیالہ میں مقیّد اور دریا میں آزاد ہوتا ہے۔ اسی طرح میرا وجود مذہب کے پیالے میں بند رہنا قبول نہیں کرتا۔ وہ بہتے دریا میں آزاد رہنا چاہتا ہے ______ کس کو سمجھاؤں

کس کو بتاؤں؟ تمام دنیا کے بیوقوف خدا کو حسن و مہر کے بجائے جبر و قہر کے لباس میں دیکھتے ہیں۔ اس کو ازلی اور ابدی کہتے ہیں۔ مگر حسن کو ازلی اور ابدی نہیں کہتے!! ______ کھوپڑیاں

الٹی چپکائی گئی ہیں!!

۲۵ راگست۔

رات صحن چمن میں حبس تھا اور گرمی کی شدّت نے مجھے اور اُس کو بوکھلا دیا تھا۔ ہوا نام کو نہ تھی، وہ مخمور تھی اور میں مست، اس نے کہا لبِ بام چلو، وہاں کچھ رمق ہو گی۔ چاندنی کھلی ہوئی تھی، میں اُسں کو گود میں اٹھا کر زینہ پر لے چلا۔ اس کا جسم میرے بازوں پر رکھا ہوا تھا۔ اور اس کی صندلی باہیں میری گردن میں لپٹی ہوئی تھیں۔ پہلے زینہ پر میں اُسں کو لے کر ایک سانس میں چڑھا۔ جیسے کڑی کمان کا تیر! وہ میرے آغوش میں آنکھیں بند کئے ہوئے قدم بقدم بلند ہونے کا مزا لوٹ رہی تھی، —— پہلے زینہ کو ختم کر کے میں نے ایک لمحہ توقف کیا کہ ذرا اپنے آغوش کی گرفت کو درست کر لوں۔ پھر میں دوسرے زینہ پر چڑھا، رفتار ذرا سُست تھی، مگر کیف باقی تھا۔ ہوا کے دو چار معطر جھونکے بھی فروغ مے سے تمتمائے ہوئے چہرہ پر بہت خوشگوار معلوم ہوئے، میں نے یہ زینہ بھی ختم کر لیا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور ہونٹ میرے گلے کو آہستہ آہستہ پیار کر رہے تھے —— میں نے پھر اس کو اپنے آغوش میں سنبھالا، ذرا دم لیا تیسری منزل دور نہ تھی، مگر جی چاہتا تھا کہ دوسری ہی منزل پر ٹھہر جائیں!

کہیں وہ یہ نہ سمجھے کہ "تو تھک گیا" دل نے کہا، میں نے پھر ہمّت کی اور اُس کو گود میں سمیٹ کر تیسری منزل کے زینہ پر چڑھنے لگا۔ اس کو کچھ خبر نہ تھی، مگر میرے لئے اس تیسری منزل کا ہر قدم کس قدر گراں اور مشکل ہو گیا، تھا۔ پسینہ آ گیا، ان چند سیڑھیوں میں ہر سیڑھی ایک کڑی منزل تھی، سانس کا سلسلہ تیز ہو گیا ہر دو قدم کے بعد دو منٹ دم لینے لگا۔ ——

اس کو اب بھی کچھ خبر نہ تھی کہ مجھ پر کیا گذر رہی ہے —— میں ہانپ رہا تھا، جی چاہا کہ ایک سیڑھی پر بیٹھ کر ذرا سستا لوں، یا اُس کو گود سے اُتار دوں —— اندر سے آواز آئی —— ایسا نہ کیجیو، وہ سمجھے گی تم تھک گئے —— مردوں کی تھکن کتنی ہی ہو، پر عورت اس کو نہ سمجھے! —— مردانہ نخوت نے سہارا دیا، باقی سیڑھیاں کسی نہ کسی طرح طے کیں، صحن بام پر پہونچکر میں نے کہا۔ "لو اب گود سے اترو" اُس نے اپنی نیم ہوشیار آنکھیں کھولیں —— "بس آ گئے؟ پہونچ گئے؟ ایک منزل اور ہوتی تو میں اسی طرح تمھاری گود میں سوار چڑھتی" —— اُس "بس" کی بلاغت نے مجھے شرما دیا۔ میں نے کہا، اب اگلی منزل اور تو کوئی نہیں، آسمان ہے، کہو تو اُدھر کا رُخ کروں؟ ——

دل کہہ رہا تھا، کب یہ گود سے اُتریں گی!! ——— تیسری منزل کے کھلے ہوئے صحن میں ایک نرم قالین پر میں نے اس کو اپنی گود سے اس طرح، لوٹ دیا ——— بکھیر دیا ——— جس طرح دامن سے پھولوں کو! میں پسینہ میں نہا رہا تھا، ہانپ رہا تھا، کمر میری کمان ہو رہی تھی، مگر وہ میرے آغوش کی گرمی سے مست و مخمور تھی، اس کا دل اس طرح میرے دل کے پاس دھڑک رہا تھا! جس طرح عورت کا دل، مرد کے آغوش میں دھڑکتا ہے! کس قدر مختلف تھی میری اور اُس کی حالت! وہ سُرور عیش میں غرق، میں تھکا ہوا!! گویا وہ کہتی تھی بس نہیں! ——— اور

——— اور میں شرمایا جاتا تھا! ——— اسی کا نام بڑھاپا ہے! ——— شباب کے روانہ ہونے والے قافلہ کی پہلی گھنٹی! جب آدمی پھولوں کی ایک گٹھری کو لیکر تین منزل بھی نہ چڑھ سکے تو سمجھ لیجیے کہ "رستم خانی" ختم ہوئی! ——— اپنے اس انحطاط کو ہر مرد دوسروں سے چھپاتا ہے، مگر کب تک؟ وہ تھک جاتا ہے، اس کے لب بھی تھک جاتے ہیں، اس کے آغوش کی گرفت بھی تھک جاتی ہے اور کوئی اُس کے کان میں کہتا ہے:-

اٹھئے بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی

۵ ستمبر ۔

میاں اختر کے ایک دوست نے کل کسی وجہ سے خودکشی کرلی، اختر بہت مغموم آیا۔ کہنے لگا۔ خودکشی دیوانگی ہے یا بے اختیاری و بزدلی۔ میں نے کہا، ان میں سے کوئی بات بھی خودکشی کے فلسفہ کی تشریح نہیں کرتی اگر مان بھی لیا جائے کہ خودکشی دیوانگی کا ایک مظاہرہ ہے تو بھی یقیناً وہ ایک بڑا کام ہے ——— ہر بڑا کام دیوانگی کی حالت میں انجام پاتا ہے۔ کوئی بڑا کام بغیر دیوانگی کے انجام نہیں پاتا۔ اگر دیوانگی ہی کو خودکشی کا سبب مان لیا جائے تو بلاشبہ وہی سبب اس فعل کے ارادہ کی بلندی کا ثبوت ہے۔ بے اختیاری اور دیوانگی بغیر مچھر اور انسان میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اب رہی بزدلی تو خودکشی کے فلسفہ میں تو بزدلی کو کوئی دخل ہی نہیں، دوسروں کی جان لینا اکثر بزدلانہ جذبات پر مبنی ہو سکتا ہے مگر خود اپنی جان لینا یا دینا بہادری عالی حوصلگی خودمختاری اور آزادی کا سب سے بڑا مظاہرہ

ہے۔ اس فعل کی معنوی حیثیت پر غور کرو تو مذہب و اخلاق کے فیصلے اور فتوے بالکل لغو اور بے معنی معلوم ہوتے ہیں۔ انسان کی زندگی کا سب سے اعلیٰ تخیل آزادی کا تخیل ہے ——— عمل ضمیر اور ایمان کی آزادی، جس پر مذہب قبضہ جمائے بیٹھا ہے۔ خدا اور اس کی شان جبر و قہر کے تخیل نے آزادی کی معنویت کو فنا کر ڈالا۔ گویا انسان ایک ایسا بندہ ہے ——— لاچار اور مجبور ——— اپاہج اور کوڑھی ——— جس کی ناک میں ایک مضبوط نکیل پڑی ہوئی ہے اور یہ بیل اس نکیل کی رسی کے ذریعہ سے کھینچا جاتا ہے۔ دوڑایا جاتا ہے، گھسیٹا جاتا ہے، باندھا جاتا ہے ———

وہ خود اپنی مرضی سے نہ ایک قدم اٹھا سکتا ہے۔ نہ بغیر اجازت آنکھ کھول سکتا ہے، نہ ایک لمحہ سوچ سکتا ہے، پھر جب ان بیلوں میں سے کوئی ایک ناک کو نکیل سے نکال کر رسی کے پھندے توڑ ڈالتا ہے اور آزاد ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تو مرتد کہلاتا ہے، کافر کہلاتا ہے، مردود و ملعون، کے نام سے یاد کیا جاتا ہے! میں نے اختر کو ایک مشہور روسی مصنف کے چند فقرے سنائے جو وہ اپنے ہیرو کی زبان سے ادا کراتا ہے!

یہ ہیرو خودکشی کرنے کے متعلق اپنے ارادہ پر انسان کی خودمختاری اور آزادی

کے فلسفہ کو دلیل لاتا ہے اور کہتا ہے :-

"مجھے تعجّب ہوتا ہے کہ سب لوگ کیونکر بلا تامّل جیتے رہتے ہیں ـــــ اس غلامی کی حالت میں ـــــ کیا اس دنیا میں ایک بھی ایسا مرد نہیں۔ جو اپنی شخصی آزادی کا معتقد ہو کر اپنی ہستی کے سب سے نازک معاملے میں خود مختاری جتانے کی ہمّت کر سکے؟ ـــــ میں اپنی خود مختاری ثابت کرنا چاہتا ہوں میں اسے ثابت کروں گا چاہے مجھے ایک بھی پیرو اور شریک کار نہ ملے۔ مجھ پر لازم ہے کہ اپنے گولی مار لوں کیونکہ اپنے ہاتھوں سے فنا ہونا خود مختاری کی انتہا ہے! ـــــ"

اختر اپنے دوست کے غم میں اور اس غم سے زیادہ اپنی دیرینہ توہم پرستی میں مبتلا تھا، وہ میرے اس نکتہ کو سمجھتا تو کیا۔ شاید اُس نے سُنا بھی نہیں، کہنے لگا۔ "اب اس بحث سے فائدہ کہ مرحوم کا فعل اچھا تھا یا بُرا؟ مجھے تو اپنے دوست کی جُدائی کا غم بے حال کئے دیتا ہے"!! میں نے کہا اختر! غم کی حقیقت بہت ناقابل اعتنا ہے۔ وہ محض ایک اصطلاح ہے ـــــ بے معنی ـــــ ایک نہایت عارضی کیفیت ہے،

جو کمزور دل و دماغ پر طاری ہوتی ہے، دل و دماغ جس قدر کمزور ہوتا ہے اسی قدر زیادہ یہ کیفیت طاری ہوتی ہے۔ کوئی غم باقی نہیں رہتا۔ اگر ہر شخص اپنی عمر کے مغموم کرنے والے واقعات کا حساب لگائے تو ابتدا سے انتہا تک اس کو اپنی زندگی کے سینکڑوں، ہزاروں واقعات ایسے یاد آئیں گے جو اس کے انتہائی غم والم کا باعث ہوئے تھے اور جن میں سے ہر غم ایسا تھا کہ وہ اسکو جانگداز سمجھتا تھا۔ لیکن غم گذر گیا اور جان موجود ہے! مثلاً جب اکلوتا بیٹا مرا تو اس نے دیواروں سے اپنا سر ٹکرایا، وہ ہفتوں، مہینوں، برسوں، مبہوت اور بے حال رہا، برسوں اُس کے آنسو خشک نہ ہوئے وہ قبر پر مجاور بن کر بیٹھا، وہ تمام لذات دنیا سے دست کش ہو گیا، اس کو یقین تھا کہ وہ اسی غم میں گھُل گھُل کر مر جائے گا! ——

مگر —— ہوا کیا؟ ہوا یہ کہ چند روز بعد وہی انسان ہے، وہی دیواریں ہیں وہی خشک آنکھیں ہیں، وہی دنیا کی لذتیں ہیں! بیٹے کی قبر پر نہ اب چراغ ہے، نہ پھول ہیں! غمگین باپ اب غمگین نہیں! اُس کو رفع غم کے بہت سے ذرائع مل گئے، —— اب اسکی زندگی کا وہ حادثہ ایسا ہے جیسے کسی نے بہتے دریا کے ساحل پر کھڑے ہو کر ایک سنگریزہ پانی پر پھینکا،

اس سنگریزے کے گرنے کی آواز آئی، تھوڑی دیر تک پانی کی سطح پر گول دائرے بنتے رہے۔ اس کے بعد پانی کی سطح پھر ہموار ہوگئی ——————— دریا کا، بہاؤ ایک لمحہ کے لئے بھی نہ رک سکا ———————

میں نے اختر سے کہا کہ تم پہلے اپنے ہی باپ کا حال دیکھ لو۔ جب تمھاری ماں ان کی چہیتی بیوی مری تھیں تو دو برس تک وہ کس طرح زمین پر لوٹا کرتے تھے اور ہم لوگ سمجھتے تھے کہ وہ پاگل ہوکر اسی حال میں مرجائیں گے! ——— لیکن ہوا کیا؟ دریا کی وہ موج گذر گئی۔ ہمارے چچا صاحب قبلہ نے ۶۵ سال کی عمر میں دوسرا بیاہ رچایا، اولاد پیدا کی، ڈاڑھی پر خضاب لگانے لگے۔ بچّوں کو گود میں لئے شاداں و فرحاں، ہنستے مسکراتے، پھرا کرتے ہیں۔ کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ بڑے میاں وہی ہیں جو دس برس پہلے دیوانوں کی طرح، قبرستان کی قبروں سے سر ٹکراتے پھرتے تھے۔ اس عارضی اور نقش بر آب کیفیت کو ——————— میں نے کہا ——————— آدمی پیدا ہی کیوں ہونے دے۔ وہ تکلیف جو چند روز بعد یقیناً رفع ہوجانے والی ہے چند روز بھی کیوں ہم پر مسلّط رہے۔ اس کیفیت کو ہم پیدا ہی کیوں ہونے دیں۔ میری خود تو یہ حالت ہے کہ میرا کوئی عزیز، دوست،

یا معشوق مر جائے تو میرا توحش اور تردد بمشکل اس وقت تک باقی رہے گا جب تک اس کے کفن دفن سے فراغت حاصل ہو، اس کے بعد، جو چیز گذر گئی، اس کو یاد رکھ کر میں اپنے قلب کو چند روز بھی افسردہ رہنے کی اجازت نہیں دیتا - یہ سچ ہے کہ مجھے اس انسانی کمزوری کو رفع کرنے کی ——— جس کو غم کہتے ہیں ——— تھوڑی سی کوشش ضرور کرنی پڑیگی - مگر یقین جانو، میں نے اکثر کامیابی کے ساتھ یہ کوشش کی اور دوسروں کے کے مقابلہ میں اپنی اس کمزوری کو بہت کچھ رفع کرلیا ہے - آخر کہنے لگا - خدا وہ دن نہ لائے - لیکن اگر کوئی وقت ایسا آیا تو تمھاری غم ربا طاقت کے کرشمے ہم بھی دیکھیں گے - پھر وہ کہنے لگا - تم بھول گئے "لیلیٰ" کے عشق میں تمھارا کیا حال ہوا تھا - میں نے کہا تو بیوقوف ہے - جس کو تو غم سمجھا وہ غم ہی نہ تھا مستی کا ایک جھونکا تھا "طلب" کا ایک جذبہ تھا ——— محبّت کی شراب بالکل میٹھی ہو تو بے کیف ہو جاتی ہے، اس کے اندر تھوڑی تلخی بھی باقی رہنی چاہئے - عیش کے پجاری اپنی آنکھوں سے جو آنسو گراتے ہیں وہ آنسو خود جزو عیش ہوتے ہیں - ان آنسوؤں کو اُن آنسوؤں سے کیا علاقہ جو کفنائے دفنائے مُردے کے لئے بہائے جائیں! آنسو بہانے ہوں

تو کسی جیتے جاگتے دلربا کے لئے ہاؤ۔ میں اعتراض کروں تو گناہگار!

۱۱ستمبر۔

حسین عورت کی محبت دل اور دماغ اور جسم کے تمام قویٰ کو متاثر، ماؤف اور مجبور کر دیتی ہے، مگر معدہ اور آنتیں اپنی آزادی اور خود مختاری اُس حال میں بھی قائم رکھتی ہیں! "عشق" کا کتنا ہی شدید حملہ ہو مگر بھوک ضرور لگتی ہے اور نہ بھی لگے تو بھی کھائے بغیر مفر نہیں، تقاضا ہو یا نہ ہو معدہ اور آنتوں کو ان کا خراج ہر حال میں ادا ہی کرنا ہوتا ہے! عشق کی شہنشاہیت کو آنتیں کسی طرح قبول نہیں کرتیں! جو لوگ اس حقیقت کو یاد رکھتے ہیں وہ حسن پرستی کی زندگی کو اپنے لئے قدرے آسان بنا لیتے ہیں میرے ایک دوست تھے خدا بخشے ——— ۶½ فٹ کے قریب ان کا قد، جسم کے وزن کا یہ حال کہ معمولی کرسی یا پلنگ اس کا حریف نہ ہو سکے۔ مزاج شاعرانہ طبیعت رندانہ، ذات کے ٹھیٹھ پٹھان، متوسط حیثیت کے زمیندار، دلّی کی ایک بازاری عورت پر مفتون تھے ان کے عشق کا موسم مقررّہ تھا۔ زمینداری میں تحصیل وصول

کا وقت سال میں دو دفعہ آتا ہے، ایک دفعہ جولائی میں، ایک دفعہ دسمبر میں،
یہی خان صاحب کی عشق کی تجدید کا زمانہ ہوتا تھا۔ گاؤں سے چار پانچ ہزار
روپیہ وصول کیا۔ بجنسہٖ لوہے کے بکسوں میں بھرا اور سیدھے دلّی آ گئے
"عشق" اپنی پوری شدت کے ساتھ شروع ہو گیا، بی صاحبہ بھی خان صاحب
سے جوابی التفات کرنے لگیں۔ دو تین مہینے دن اور رات محفل عیش جمی،
خان صاحب کا یہ حال کہ ایک لمحہ کے لئے بھی معشوقۂ طنّاز کا آنکھوں سے
اوجھل ہونا گوارا نہیں، اسی حالت میں رفتہ رفتہ لوہے کے بکس خالی ہونے لگے
آخر کار جس دن ملازم نے دست بستہ عرض کیا کہ سرکار! اب صرف ریل کے کرایہ
کے بقدر روپیہ باقی ہے، خان صاحب کے عشق کا سمند بادپا دوڑتے دوڑتے
دفعتاً رُکا، سامان بندھنا شروع ہو گیا، دو روز بعد خان صاحب رخصت ہو گئے
بی صاحبہ اسٹیشن تک اُن کو "خدا حافظ" کہنے آئیں، خان صاحب وطن کو
سدھارے ——— تین چار مہینہ بعد جب خریف کی فصل کا روپیہ
وصول ہونے لگا تو عشق کے جراثیم بھی بیدار ہونے لگے اور پھر دلّی کے کسی
ہوٹل میں حُسن و عشق کی وہی آویزش شروع ہو گئی، تقریباً ۲۰ برس تک خان صاحب
اسی وضعداری کے ساتھ "عشق" کرتے رہے، اور اُن کی معشوقہ بھی اُن کے ساتھ

نباہتی رہیں، حتیٰ کہ ان ہی کی گود میں ایک دن خان صاحب نے ایسی آنکھیں بند کیں کہ پھر کبھی نہ کھولیں! مرحوم اکثر کہا کرتے تھے کہ معدہ پر عشق کا زور نہیں چلتا۔ جسم کا بادشاہ دماغ سمجھا جاتا ہے یا دل مگر دونوں حسن و عشق کے مقابلہ میں اپنی حکومت سے دست بردار ہو جاتے ہیں لیکن معدہ حضرت عشق کا حکم کسی طرح نہیں سنتا! دونوں وقت پیٹ بھر کر روٹی ملتی رہے تب ہی حسن کا جوہری ان موتیوں کو پرکھ سکتا ہے! پیٹ خالی ہو تو چودھویں کا چاند اور آسمان کا تارا اس کی "طلب" کو تسکین نہیں دے سکتا

——— مٹھی بھر آرد گندم اس سب پر بالا ہے!!

۱۹ ستمبر۔

بیوقوف، گدھے، عقل کے پیچھے لٹھ لئے پھرتے ہیں۔ سائنس، سائنس، سائنس، سنتے سنتے تھک گیا ہوں! خدا جانے کس طرح بی۔ اے کے درس میں پروفیسر نے یہ بلا میرے دماغ میں ٹھونسی ہوگی، اس دن کے بعد سے آج تک پھر تو میں نے کبھی نام نہیں لیا۔ کہتے ہیں کہ علم کی افزونی انسانی تہذیب و تمدن کی ترقی کا باعث اور عقل کی ترقی و وسعت اکثر دینوی

زندگی میں راحت کا موجب ہے۔ لاحول ولا قوۃ۔ دنیا کو تباہ کیا علم کی افزونی اور عقل کی افزائش نے۔ ہم کو راحت اور سکون قلب سے محروم کیا علوم کی ترقی نے ـــــ انسانوں کے قلوب مجبور کر ڈالے، زندگی کا سکون واطمینان خاک میں ملا دیا ـــــ سانس لینا مشکل ہو گیا ـــــ علم کی اس ترقی اور عقل کے اس ارتقا کی بدولت! جو کام پہلے مذہب کرتا تھا وہ اب سائینس انجام دیتی ہے، اوّل تو مذہب نے انسانوں کو انسانوں سے لڑایا، خون کی ندّیاں بہائیں، مخلوق کو بھوکا مارا، کسی طرح مذہب کا زور ٹوٹا تو اب سائینس کا عفریت میدان میں بل کھاتا ہوا آیا۔ پہلے اللہ اور رسول کا نام لے کر "تہذیب" اور "اخلاق" کے عَلَم بلند کئے جاتے تھے اور ان عَلَموں کے سایہ میں خون پیا جاتا تھا اور ہڈیاں چبائی جاتی تھیں، اب سائینس اور عقل کا دیوتا ہمارے دماغوں پر چھایا ہوا ہے۔ مفر کی صورت کوئی بھی نہیں!! یہ تو سب کہتے ہیں کہ سائینس نے انسان کو بہت فائدہ پہونچایا مگر ثابت کوئی نہیں کر سکتا کہ فائدہ پہونچایا کیا، سوال کیجئے تو کہیں گے، واہ، یہ ریل یہ تار برقی، یہ بجلی، یہ ٹیلیفون، یہ آلاتِ ہوائی ـــــ یہ اور یہ اور یہ! ان بے وقوفوں سے پوچھئے کہ جب یہ نعمتیں دنیا میں نہ تھیں

توانسان آج سے بہتر حالت میں زندہ تھا یا نہیں؟ مانا کہ اس کے سفر لمبے اور تکلیف دہ، اس کے کھانے بیمزہ اور پھیکے، اس کا لباس موٹا اور بھاری تھا، مگر اُس کی عمر آج کے مقابلہ میں کتنی زیادہ، اس کے قویٰ کس قدر مضبوط اس کا دل کیسا مطمئن تھا! یہ سچ ہے کہ رکابدار ایسے نہ تھے، درزی اپنے فن میں اس قدر ہوشیار نہ تھے، دھوبی اس قدر صاف کپڑے بجلی کی مشینوں سے نہ دھو سکتا تھا مگر دل میلے نہ تھے۔ بے چین اور کمزور بھی نہ تھے، اُس گذرے ہوئے زمانہ میں جس کو آج کل کے نام نہاد اہل علم "زمانۂ جاہلیت" کے نام سے یاد فرماتے ہیں زندگی کے متعلق انسان کے عقائد سیدھے سادھے تھے۔ زندگی کا تار اس قدر اُلجھا ہوا نہ تھا۔ اسی لئے اس کا معدہ غذا کو اطمینان اور آسودگی کے ساتھ بہ آسانی ہضم کر لیتا تھا۔ آج جبکہ مذہب اور عقائد میں ایک طرف اور دُنیوی معاملات میں دوسری طرف، بال کی کھال نکالی جا رہی ہے۔ جب کلیسا اور مسجدوں کے ممبروں سے چیخ چیخ کر لمبے لمبے وعظ سُنائے جا رہے ہیں۔ جب قوموں کے لیڈر اور ڈکٹیٹر قوم پرستی اور وطن پرستی کے گیت گا رہے ہیں، انسان ایک وقت کی روٹی سکون کے ساتھ بیٹھ کر نہیں کھا سکتا۔ "عہد جاہلیت"

کے مقابلہ میں آج اس کو کھانے پینے کے انتہا لذیذ ملتے ہیں، لیکن وہ کرے کیا اس کا معدہ ان لذائذ کا حریف نہیں ہو سکتا! بستر بھی اس قدر نرم ہیں جیسے کہ پہلے کبھی نہ تھے مگر دماغوں میں خشکی ہے، نیند رات بھر نہیں آتی! زندگی کے دریا کے کنارے علم و فضل کے بہت اونچے اونچے مینار بنائے جا رہے ہیں مگر یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ دریا کا پانی کس قدر گدلا ہو گیا ہے۔ آب مصفّا کے بجائے کیچڑ اور دلدل زیادہ ہے! زندگی کا فلسفہ ہزاروں لاکھوں کتابوں سے لدی ہوئی الماریوں میں محفوظ ہے۔ لیکن فلسفہ زیادہ اور زندگی کم ہے! کوئی دن آئے گا کہ فلسفہ ہی فلسفہ رہ جائیگا اور زندگی نام کو بھی نہ رہے گی آدمی مشین بن کر رہ جائیں گے۔ جو ریاضی کے اعداد کی ضرب اور جمع کا حساب لگا لگا کر سانس لیا کرینگے، آنکھوں اور کانوں اور ناکوں میں سائنس کے معمل کی نلکیاں ٹھسی ہوئی ہونگی۔ عقل پر فلسفہ کا غلاف چڑھا ہوگا! یہ حالت آج بھی کچھ کم نہیں، مدرسوں اور علمی اداروں میں کہیں ؎

"دعویٰ مفروض کامل"۔

"مقدم دائمہ"

"مصطفات"

"اوّلیاتِ عامّہ"

"علّتِ مستقیم"

"منافی کامل یا ناقص"

"تعمیماتِ تجربی"

"مغالطاتِ منافات"

"علّتِ قریبہ" اور "علّتِ غیر مستقیم"

"قضیہ سالبہ و موجبہ"

کی بحث جاری ہے اور طلباء گتھے ہوئے ہیں! کہیں

"تفاعیل زائدی"

"سلسلہ اہتزازی"

"علم مثلث"

"قانونِ تقسیمی"

"ترکیب و تحلیل"

کے جھگڑے پڑے ہوئے ہیں، پھر اگر ایک طرف

"مابعد الطبیعات"

"روحانیات"

"سرمدیت"

"ہیولیت" اور

"فوق العقلیت"

کی اُلجھنوں میں طالبانِ علم کی عمریں ضایع ہو رہی ہیں تو دوسری طرف

"مذہب تشبیہ"

"تلازم اختراعی"

"محور استوائی"

"اختلاف استلزامی"

"نفس اجتماعی"

"جذبات لاقوتی"

"حقیقت خارجیہ"

"ردِ عمل"

"شعور ذات" اور

"شعور اجتماعی"

کے قلعے بنائے جارہے ہیں اور گرائے جارہے ہیں"۔ لطافت وکثافت نوعی" کے گنبد میں طبعیات کے ماہرین "خارجی" اور "داخلی" عمل کی رسہ کشی کر رہے ہیں اور اپنے افکار عالیہ (۱) کے نقوش بناتے ہیں اور بگاڑتے ہیں بناتے ہیں اور بگاڑتے ہیں! ——— کہیں دماغوں کے "خلا" میں "رطوبت زجاجیہ" اور "تعادل غیر قائم" کے نظریئے کو دوائے اور دوڑائے جارہے ہیں! ——— نظریئے ہیں کہ آپس میں ٹکرارہے ہیں! بنتے دیر نہیں ہوتی کہ بگڑ جاتے ہیں، علوم کی فہرست دیکھئے تو وہ ایک شیطان کی آنت ہے، علم سیاست، علم نباتات، علم الافلاک، آثار قدیمہ! اقتصادیات، معاشیات، علم النفس، منطق، فلسفہ، ہندسی، مخطوطات، مجسمات، علم مثلث، طبعیات، مابعد الطبعیات، ریاضی، طبقات الارض اور خدا جانے کیا کیا؟ کدوکاوش کی کوئی انتہا نہیں، اس تمام کدوکاوش کا آخری نقطہ، نتیجہ، ماحصل؟ یہ ہے کہ:-

دانکس کہ نہ داند و بداند کہ بداند
درجہل مرکب ابدالدہر بماند

اس جہل مرکب کا نام ہے۔ تہذیب، تمدن اور علم و فضل!!

اصطلاحیں ہیں اور الفاظ کی ترکیبیں اور دماغی الجھٹے! سلجھائے جاؤ، الجھائے جاؤ!!

ایک دن کسی رسالہ میں ایک مزیدار لطیفہ پڑھا تھا، کسی پروفیسر صاحب نے اپنی ساری عمر حساب لگانے میں صرف کی، تب وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ دنیا کی عمر اب بیس لاکھ سال اور باقی ہے، انھوں نے زمین کے طبقات کا مطالعہ کیا، موسموں کے تغیرات پر غور کیا، زمین کی رفتار کا حساب لگایا، اجسام فلکی کے حالات پر نظر ڈالی۔ سمندر اور خشکی کے گھٹتے بڑھتے رقبہ کو محسوب کیا، ساری عمر اس مصیبت میں مبتلا رہے تب کہیں اس نتیجے پر پہنچے کہ دنیا ۲۰ لاکھ سال بعد ضرور ختم ہو جائیگی، ایک دوسرے پروفیسر صاحب نے جب ان کا مضمون پڑھا تو وہ ایک صفر کم پڑھ گئے اور سمجھے کہ اوّل الذکر پروفیسر صاحب کی رائے میں دنیا کی عمر صرف ۲ لاکھ برس باقی ہے، انھوں نے اسی بنیاد پر ایک جوابی مضمون لکھا اور ثابت کیا کہ دنیا کی عمر ۲ لاکھ سال سے بہت زیادہ باقی ہے! پھر تو دونوں طرف سے رسائل میں بحث و مباحثہ کا ایک ہنگامہ برپا ہو گیا۔ گویا کہ ۲۰ لاکھ اور ۲ لاکھ کے فرق پر ان دونوں پروفیسر صاحبان کی زندگی کا انحصار

تھا، ان بیوقوفوں کی نظر اس پیش پا افتادہ حقیقت سے دور ہی رہی کہ دنیا کا خاتمہ تو اسی دن ہے جس دن ان کی دنیوی زندگی کا خاتمہ ہوگا۔ سوال تو صرف دس پانچ سال کا تھا۔ اِدھر یا اُدھر —— اور بحث ہونے لگی بیس لاکھ اور دو لاکھ کے فرق پر! ——

اسی طرح ایک زمانہ سے اجرام فلکی اور دنیا کے درمیان طول مسافت ناپا جا رہا ہے۔ سفر کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ مریخ سے پیام و سلام کے ذرائع پیدا کیے جا رہے ہیں، گویا کہ اس دنیا اور مریخ کے درمیان ڈاکخانہ اور تار گھر قائم کر کے ہماری دنیا پر بڑا ہی احسان کیا جائیگا۔ گھر کے صحن سے دروازہ تک، اور دروازے سے سڑک تک کے سفر پر تو اختیار حاصل نہیں اور انتظام ہو رہے ہیں ۵ کروڑ میل کا سفر ۵ دن میں طے کرنے کے!

تو کارِ زمیں را نکو ساختی،
کہ با آسماں نیز پرداختی،

—— کوئی پوچھے کہ احمقو! اگر تم نے یہ معلوم بھی کر لیا کہ اس دنیا اور مریخ کے درمیان صحیح فاصلہ کیا ہے تو ساری عمر اسی حساب میں کھپا دینے کے بعد تمھاری احمقانہ محنتوں کا نتیجہ کس کے کام آئے گا۔

اصل یہ ہے کہ ہماری ساری زندگی مصطلحات، اور محاورات اور قیاسات اور تصوّرات کے اُبھٹے میں اُلجھی ہوئی ہے، انسان کا تمام تر مادی اور روحانی وجود اس اُبھٹے میں اس طرح پھنسا ہوا ہے، جس طرح جال میں ایک چڑیا، واہمہ کی عمارتیں بہت بلند اور بہت عالیشان بنائی جاتی ہیں، مگر ان سب کی بُنیاد اُس حقیقت مسلمہ پر ہوتی ہے جس کا نام "قانون فنا" ہے!! ماہرین علوم بنیاد کو تو دیکھتے نہیں، مُنہ اُٹھائے اونچی محرابوں اور بلند میناروں اور عالیشان گنبدوں کو دیکھنے میں محو ہیں۔ —— آسمان کی طرف مُنہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ زمین کی طرف ان کی گردن جھکتی ہی نہیں! ہر شخص اپنے واہمہ پر ایک لیبل لگا دیتا ہے۔ جبّہ و عمامہ کے لیبل الگ ہیں، سائنس اور علوم کے لیبل الگ ہیں، ان کے خدا کو یہ نہیں مانتے اور ان کے خدا کو وہ نہیں مانتے! دنیا اور عاقبت کے فیصلے دونوں کر رہے ہیں —— اپنے اپنے حلقۂ حمق میں! کچھ اصطلاحی صفات مقرر کر لی گئی ہیں، اچھے بُرے کا ایک معیار مقرر کر دیا گیا ہے —— یہ اچھا، یہ بُرا! یہ گناہ، یہ ثواب، یہ صحیح یہ غلط، یہ پاک، یہ ناپاک —— کیوں؟ وجہ؟ ثبوت؟ —— جواب کا تو ذکر ہی کیا، سوال کرنا بھی گناہ ہے!! مولانا کا عصا، ماہرِ علوم کا قلم

دونوں میں گتھم گتھا ہے۔ بیچ میں پس رہا ہے وہ غریب جو اس دنیا میں امن، آسودگی اور سکون قلب کے ساتھ اپنی مختصر زندگی گذارنا چاہتا ہے اور نہیں گذار سکتا۔ اس کو احکام دیئے جاتے ہیں ——— دلائل سے بے نیاز، اس کے فیصلے عاید کئے جاتے ہیں ——— اس کے فہم و ادراک سے بعید! ہدایات نافذ کی جاتی ہیں ——— چون و چرا سے بالا۔ ———

——— زندگی کے اس گھرے کھر میں مجبور و معذور انسان ٹٹولتے ٹھوکریں کھاتے، گرتے، گھسٹتے چلے جا رہے ہیں، کچھ نہیں جانتے ——— سوائے اس کے کہ "اختیار" کچھ نہیں اور "جبر" بے پناہ ہے! ———

——— اختر کہنے لگا، تمہارا روزنامچہ چھاپا جائے تو کیا ہو؟

میں نے کہا ہوگا کیا؟ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ مذہب اور عقل کے ٹھیکیدار مجھ سے خفا ہو جائینگے، ہو جائیں! اگر مذہب والے مجھے جنت کی نعمتوں سے محروم کر دیں اور عقل والے مجھے پاگل خانہ میں داخل کرا دیں تو میرا کیا نقصان ہے۔ میں نہ مذہب کی دی ہوئی جنت کی تمنا رکھتا ہوں، نہ عقل کی محفلوں میں بار پانے کی خواہش، پھر جو دنیا اور دین کے یہ ڈکٹیٹر مجھ سے خفا ہو جائیں تو مجھے کیا پروا ——— ہو جائیں خفا!!

۲۸ ستمبر۔

روزنامچہ کے گذشتہ اندراج کو اختر نے بہت ناک بھوں سکیڑ کر پڑھا، کہنے لگا، یہ سب پاگلوں کی سی بکواس ہے، زندگی کے سارے راستے بند کرتے ہو اور خود کوئی راستہ پیدا نہیں کرتے۔ چاہتے کیا ہو؟ میں نے کہا صاحبزادے، زندگی کے راستے کہیں پیدا کرنے سے پیدا ہوا کرتے ہیں، ہوا پچھوا یا ہو تو تم اس کو پوروائی نہیں بنا سکتے، موسم برسات کا نہ ہو تو تم بادل کہاں سے لاؤ گے، یہ سب کارخانہ مقرر ہے، مقرر نہ بھی ہو تو ہمارے تمھارے اختیار سے باہر ہے ——— ساری زندگی اختیار سے باہر ہے، تم جو ہوا کے لئے رفتار اور بادلوں کے لئے بارش کے قواعد و ضوابط نافذ کرنا چاہو تو یہ کس کے بس کی بات ہے، زندگی چلتی ہے، جس طرح چلتی رہی ہے قافلہ کا رخ تم بدل نہیں سکتے، منزلیں مقررہ ہیں، راستہ کہیں ہموار کہیں ناہموار جیسا ہے، ویسا ہے، تم جو کہو، لاؤ سیمنٹ کی ایک اعلیٰ سڑک تیار کر کے اس پر سفر کریں تو یہ گرہ بھر کی زبان ہل کر رہ جائیگی، ہونا کچھ بھی نہیں، اسی لئے کہتا ہوں ان جھگڑوں میں نہ پڑو، جس طرح گذر رہی ہے۔ گذارے جاؤ دھوپ ہو تو تم سایہ پیدا نہیں کر سکتے، رات ہو جائے تو تم سورج،

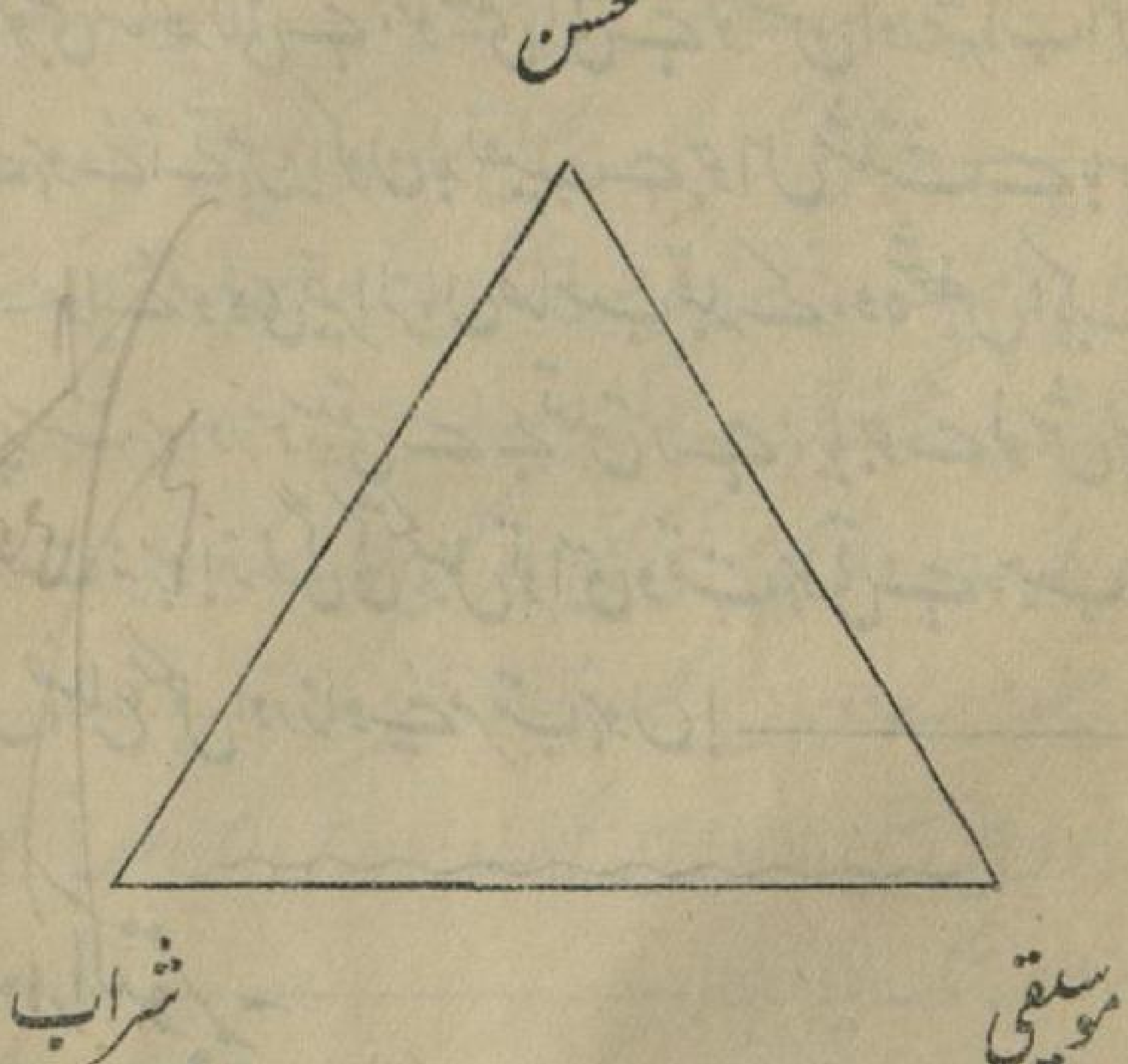
کو نکال نہیں سکتے، نہ اندھیرے میں اُجالا کر سکتے ہو، نہ اُجالے میں اندھیرا
دونوں حالتوں میں ——— ہر حالت میں گذرے چلے جاؤ! لڑکپن، جوانی
بڑھاپا، جس منزل پر گذرو، اسی منزل کے دستور کی پابندی کرو، ——— اور
کچھ بھی کرنا نہیں ——— نہ سوچنا، نہ دیکھنا، نہ شکایت نہ شکوہ، نہ
آرزو نہ کوشش! ———

اختر ہنس کر کہنے لگا، آج کل بازارِ حسن "کچھ مندا" ہے۔ تم عشق بازی
میں مبتلا رہتے ہو تو کم از کم یہ تو ہوتا ہے کہ اس قسم کی ہجو اس نہیں کرتے
میں نے کہا بازارِ حسن میں بھی خرید و فروخت اختیاری نہیں، جبری ہے،
جب وقت آتا ہے جب ہی عشق کا دورہ بھی شروع ہوتا ہے، یہ تو ہو نہیں
سکتا کہ کوئی مجھ سے فرمائش کرے کہ عاشق ہو جاؤ اور میں بہ "تعمیل ارشاد"
یا "پاس خاطر آں عزیز" فوراً عاشق ہو جاؤں! ———

۲۸ر اکتوبر۔

باپ، بیٹا اور روح القدس، مسیحیت کی تثلیث ان ہی تین پر
مشتمل ہے، اسی طرح دوسرے مذاہب کے بھی مقررہ ارکان ہیں، میرے

مذہب کے ارکان بھی تین ہیں، جرمنی میں ہٹلر کا قومی نشان "سواسٹیکا" ہے، میرا نشان ایک مثلث ہے، جس کی تثلیث اس طرح قائم ہے:-



اس مثلث کے تین اضلاع کے اندر میری تمام دنیا بند ہے۔ ان ہی "اضلاع" پر گھومتا رہتا ہوں اور اسی چکر میں مست ہوں۔ جس شخص کو اس تثلیث میں سے ایک ہی میسر آئے وہ کس قدر خوش نصیب ہے، میری قسمت کی قسم کھاؤ کہ مجھے تینوں حاصل ہیں، کس قدر مشکل ہے، ان تینوں میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا، حسن، موسیقی اور شراب! ان میں سے ایک بھی

ہاتھ آئے تو باقی دو حاصل ہو جاتے ہیں، حسن آتا ہے تو شراب کی مستی اور موسیقی کے کیف تمام کو بھی ساتھ لاتا ہے! شراب آتی ہے تو اکثر حسن اور موسیقی کو بھی ساتھ لاتی ہے، موسیقی آتی ہے تو حسن اور شراب اس کے دامن سے لپٹے ہوئے آتے ہیں! کون بدنصیب ہے جو اس مثلث سے باہر جانا چاہے ——— سوائے مولوی خیر الزماں صاحب قبلہ کے، وہ شخص ایک جوہر خام ہے جو حسن پرست ہو اور موسیقی سے بے تعلق رہے، یا جوئے نوش ہو اور کمبخت حسن پرست نہ ہو! زندگی کی تکمیل تو اسی وقت ہوتی ہے۔ جب اس مثلث کے تینوں اضلاع مکمل اور زاویئے مرتب ہوں! ———

۱۰ اکتوبر۔

خواب میں تصویریں دیکھتا ہوں، جیسے سینما کے پردے پر، گذرے ہوئے افسانے تازہ ہو جاتے ہیں، مُردے قبروں سے نکل نکل کر میری آنکھوں میں گھس جاتے ہیں، بھولی ہوئی باتیں یاد آتی ہیں، ایک ایک تصویر پردہ پر نمودار ہوتی ہے، میں اس کو پہچانتا ہوں ——— گذر جاتی ہے ——— یہ کون ہے؟ کملا دیوی! کیا قیامت تھی کمبخت! ——— یہ کون؟

نورجہاں! کس قدر شوخ تھی اس کی جوانی! ——— یہ موہنی! وہ خاص باغ کی راتیں، مرمریں حوض کے کنارے، چاندنی کا عکس پانی کی ہلکی ہلکی لہروں پر، فوارے کی بندیاں، میں اور میرے آغوش میں موہنی! ——— خدا جانے کہاں ہے ——— یہ انجمن آرا! میرے محفل شباب کی نورانی شمع ——— کس قدر جلد خاموش ہو گئی ——— تیتری کی طرح رنگین مگر جان ہار! صبح کے ستارے کی طرح دیکھتے ہی دیکھتے غروب ہو گئی!! یہ کون ہیں؟ نام یاد نہیں آتا صورت یاد ہے، مجھ سے روٹھ کر چلی گئی تھی، پھر کبھی لوٹ کر نہ آئی ———

یہ وہ ہیں جنھوں نے دو برس مجھے دنیا سے بیخبر رکھا ——— نظر میں نشہ، باتوں میں مستی، اداؤں میں کیف، دو برس اس طرح آغوش میں رہی کہ وہ مزا اب تک یاد ہے! ——— ایسی کتنی تصویریں میرے وجود معنوی کے پردے پر نمایاں ہوتی ہیں، مگر ان سب میں ماضی کے اس تمام منظر عام میں، اس تمام انتشار میں، ایک دھندلی سی تصویر اور بھی ظاہر ہوتی ہے، ظاہر ہوتی ہے، پھر غایب ہو جاتی ہے، پھر ظاہر ہوتی ہے، ابھی اچھی طرح دیکھا نہیں کہ پھر غایب ہو جاتی ہے!

آنکھوں کا پردہ اٹھتا ہے اور گرتا ہے، بار بار جلدی جلدی، آنکھوں کو

دیکھنے کی مہلت نہیں ملتی، مگر دل بیچین ہو ہو کر کہتا ہے، ہو نہ ہو یہ تو اُس کی تصویر ہے! ——— میں بھولا کیوں نہیں اب تک؟ میں بھول کیوں نہیں سکتا؟ وہی ہے، اگر یہ تو پھر؟ کیا وہ کانٹا ابھی تک دل میں اٹکا ہوا ہے؟ یاد آتی ہے؟ گذری ہوئی محبتوں کے مجمعے میں، سب سے الگ نظر آتی ہے، وہ سب بُھلائے جا چکے، جن کی تصویریں کبھی کبھی نظر دل کے سامنے آتی ہیں مگر ——— یہی ایک ہے جس کو بھولا نہیں بُھلا نہیں سکا! ———

لیلیٰ! لیلیٰ!! لیلیٰ!!!

۱۲ر اکتوبر۔

کوئی کہتا ہے تجھے دستاویز پر دستخط کرنے ہونگے، اقرار نامہ لکھنا ہوگا ——— تو بھاگ نہیں سکتا تو بچ نہیں سکتا، تو سستے سودے کرنے کا عادی تھا، اگر یہ سستا سودا نہیں ہے، یہ معاملہ ہی کچھ اور ہے! ———
میں گھبرا گھبرا کر کہتا ہوں۔ مجھے گرفتار نہ کرو، میں دستاویز پر دستخط نہیں کر سکتا میں نے کبھی ایسا نہیں کیا، میں کبھی ایسا نہ کرونگا۔ میں "بازاری"

آدمی ہوں، وہ "بازاری" عورت ہے، ہم دونوں ہم جنس ہیں، یکساں ہیں
کوئی کسی کا پابند نہیں، کوئی کسی کا احسانمند نہیں، کوئی کسی کا مقروض نہیں،
بازار کا سودا ہے، پھر کیوں کہتے ہو کہ "دل و دیں نقد لا"! "دل و دیں" سے
کیا بحث؟ ——————— کوئی نہیں سنتا اور ایک بھاری
چادر ہے ——————— بے خبری، مجبوری اور بے اختیاری کی۔ جس میں
میں لپٹا جا رہا ہوں!! ——————— کہاں ہے؟ ہنوز بازار میں ہے، یا
کسی گوشۂ عزلت میں یا قبر کی تاریکی میں؟ کہاں ہے؟ معلوم کرنا چاہتا
نہیں مگر خبر کا منتظر ہوں! کچھ سننا نہیں چاہتا مگر گوش بر آواز ہوں!
——————— کیا ہونا ہے؟ اگر وہ ہونا ہے جو نہ ہونا چاہئے تو پھر ہو کر رہے گا
جو کچھ ہونا ہے، یوں ہی سہی، اگر نہ بچ سکنا ہی مقدر ہے تو یوں ہی سہی!!
"جبر" ہے۔ "اختیار" نہیں! ——————— ——— ———

۴ ار اکتوبر۔

——————— لیلیٰ! ——————— لیلیٰ!!
——————— لیلیٰ!!!

۱۹ر اکتوبر۔

لیلیٰ! ——— لیلیٰ!! ———————

لیلیٰ!!! ———

۲۰ر اکتوبر۔

صبح ——— لیلیٰ!

شام ——— لیلیٰ!

شب ——— لیلیٰ!

۲۱ر اکتوبر۔

روزنامچہ کے بہت سے اوراق خالی ہیں، میری زندگی میں ایک خلا پیدا ہوگیا ہے ——— میر صاحب خبر لائے ہیں کہ وہ بنارس میں ہے۔ حُسن کی دولت دونوں ہاتھوں سے لٹا رہی ہے۔ ———

بنارس! میرے شانوں پہ پَر پیدا ہو رہے ہیں! ———

خط لکھوں ——— بُلاؤں ——— کسی

کو بھیجوں؟ ——— خود ہی جاؤں ——— کرنا کیا ہے؟ ———

۱۱ر دسمبر۔

تقریباً ۱½ ماہ کے بعد آج یہ روزنامچہ کھولا گیا، یہ ۱½ مہینہ بنارس میں گذرا، اس طرح کہ خبر نہیں، کب آیا، کیونکر آیا، یہ زمانہ کیسے گذرا؟ اختر اور میر صاحب میرے پاس موجود ہیں اور کہتے ہیں کہ میں سخت بیمار تھا، "لبِ گور تھا، اطبا جواب دے چکے تھے، احباب مایوس ہو چکے تھے ——— " میں کہتا ہوں یہ سب غلط ہے ——— جب میرے سرہانے لیلیٰ نے ۴۵ دن اور ۴۵ راتیں گذاری ہوں، اُس کے ہاتھوں نے میرے خشک لبوں کو پانی سے تر کیا ہو، اس کی انگلیاں میری نبض پر کھیلی ہوں، اس کی آواز کی موسیقی نے میرے دل و دماغ کو سکون بخشا ہو! ——— تو کس کی مجال ہے کہ وہ کہے کہ میں بیمار تھا!! حقیقت یہ ہے کہ میں اپنی عمر میں کبھی اتنا تندرست نہ تھا، جس قدر کہ گذشتہ ڈیڑھ ماہ میں رہا جب میرے جسم کی حرارت ۱۰۵ اور ۱۰۶ درجہ پر تھی!! زندگی کا شعلہ

میرے جسم میں کبھی پہلے اس قدر روشن نہ تھا۔ میری روح کبھی اس قدر قوی نہ تھی ——— یہ آنکھوں کے اندھے مجھے بیمار کہتے ہیں! بیماری تو اب شروع ہوتی ہے۔ جبکہ میرا سرہانا خالی ہے اور تیماردار چلا گیا! ———

وہ کہتی ہے، تم اس شہر میں اجنبی تھے، مجھ سے ملنے آئے تھے۔ میرے مہمان تھے، میں نے حق مہمانداری ادا کیا، اب تم اپنے وطن جاؤ، میں اپنے کاروبار میں مشغول ہوتی ہوں! میں نے کہا، شہد کے بعد اب یہ زہر کیوں؟ کہتی ہے، تم معذور تھے اس لئے میری توجہ کے مستحق تھے۔ اب تم معذور نہیں ہو ——— اپنے گھر جاؤ اور اگر میری دکان پر آنا چاہتے ہو تو ایسے آؤ جیسے سب گاہک آتے ہیں! ———

میر صاحب اور اختر کے طعنوں نے کلیجہ پکا دیا ہے، زہر میں بجھے ہوئے تیر مجھ پر دن رات چلائے جا رہے ہیں! بس! ترکی تمام شد! مرد میدان نے ہتھیار ڈال دیئے! کمر کھول دی! سرفرازوں کے سر اس طرح بھی خاک پر رکھے جاتے ہیں، شہسوار یوں بھی گھوڑوں کے قدموں میں روندے جاتے ہیں! یہ بھی ہوتا ہے؟ یوں بھی ہوتا ہے؟ آسمان کا تھوکا حلق میں! ———

فتحمندی کے دعوے فنا ہوئے، اس عبرتناک شکست ———

ہیں، بس !" ——— میں کچھ نہیں کہتا، بستر پر پڑا ہوا چھت کی کڑیاں گنا کرتا ہوں !

---

۹ نومبر

جب حسن و عشق کی الجھنوں سے گھبراتا ہوں اور زندگی کی کشمکش سے دل اکتا جاتا ہے، مذہب کے نام سے چڑ پاتا ہوں اور اخلاق و قانون کی پابندیوں سے دل میں نفرت پیدا ہوتی ہے تو کبھی کبھی یہ خیال آتا ہے کہ دنیا میں انسان کا سب سے زیادہ فطری مذہب " مذہب تشکیک" ہے، اس مذہب کی تعلیمات کو دنیا میں کیوں نہ پھیلایا جائے ——— مختلف ناموں سے پہلے بھی اس قسم کے عقاید کی تبلیغ کی جا چکی ہے۔ لیکن "مذہب تشکیک" کی کامل کامیابی کے لئے گذرے ہوئے زمانے کچھ زیادہ موزوں نہ تھے۔ لیکن اب ——— عقل و مذہب کی آویزش نے اس مذہب کے لئے نہایت موزوں فضا پیدا کر دی ہے! ——— کوئی وجہ نہیں کہ میں خود اس مذہب کا داعی اور پیغمبر بن کر میدان میں نہ آ جاؤں اور اپنی تمام موجودہ اور

آیندہ نسلوں کو اس مذہب کی طرف دعوت دوں۔ اب تک جتنے مذاہب دُنیا میں آئے اُن سب میں شیطان کی قوت رحمانی قوے پر غالب رہی، کوئی مذہب یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اس نے "شیطانیت" کو نابود یا مضمحل کردیا ہو، بلکہ تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ مذہبی اقوام کی زندگی میں "اہرمن کی رعایا تعداد میں "یزداں" کے غلاموں سے زیادہ رہی ہے ـــــ اصل یہ ہے کہ خود مذاہب نے "اہرمن" اور "شیطان" کو بہت قوی پیدا کیا ہے، اور قیامت تک کے لئے ان کی قوت کو انسان پر حاوی و مسلط کردیا ہے، اس کے بعد اپنے بندوں کو ہدایت کی ہے کہ اس قوت سے لڑو، ـــــ مقابلہ کرو، مارو، گراؤ، کہ یہی راہ نیکوں کی ہے!! "مذہب تشکیک" مذہب کی اس قدیم فرقہ بندی سے بالکل آزاد رہے گا۔ وہ "اہرمن" اور "یزداں" کی تفریق ہی کو سرے سے مٹا دے گا اور انسان کی دُنیوی زندگی کے پیش پا افتادہ حقائق پر اپنی تعلیمات کی بنیاد رکھے گا۔ نظم اور ضبط سے اس کے پیرو آزاد رہیں گے۔ اس لئے کہ نظم و ضبط ہی سب سے زیادہ بدنظمی اور افراط و تفریط کا باعث ہے ـــــ "مذہب تشکیک" میں زندگی کی تعریف

ہو گی کہ :-

"زندگی یکسر انتشار ہے، ناقابل علاج، کسی چیز کو جزو عقاید نہ بناؤ، کسی چیز کا یقین نہ کرو، اشیا، اور اشخاص کی بُری اور اچھی صفات محض اصطلاحی الفاظ ہیں، ناقابل اعتبار، جو کچھ تمھارے سامنے آئے، اس کو شک کی نظر سے دیکھو اور زندگی کا نہ کوئی اصول بناؤ نہ کوئی کلیّہ قائم کرو، کسی اصول اور کلیّہ کو تسلیم نہ کرو، "مذہب تشکیک" میں تسلیم و اقرار ارتداد سے بدتر اور عین کفر ہے، آزاد اور لاعلم اور بے خبر رہو جیسے تم پیدا ہوئے تھے، جستجو اور تلاش ایک جُرم ہے، بصیرت گناہ ہے، تمھارے اندر سے فطرت جو اشارہ کرے اس کی تعمیل کرو، عقل اور فہم کی بیہودگیوں سے اپنا دامن پاک رکھو!"

لوگ پیغمبری کے دعوے کرتے ہیں مگر مذہب کے قدیم تخیل سے آزاد نہیں ہو سکتے ایک ہی ہیولہ کو مختلف صورتوں میں دنیا کے سامنے لاتے ہیں، اور کسی نہ کسی

صورت میں "اہرمن" اور "یزدان" کا ایک تخئیل لوگوں کے سامنے رکھ دیتے ہیں! یہ سب غلط ہے۔ میں پیغمبری کے دعوٰی کرنے میں جلدی نہیں کرنا چاہتا، عدم تکمیل اور انتشار کی ایک انتہائی صورت دنیا کے سامنے لانے والا ہوں، تیاریاں کر رہا ہوں تاکہ میرے پیغمبرانہ پیغام میں ضبط ونظم کی کوئی خامی باقی نہ رہ جائے۔ صرف چند زندہ اصول دنیا کے سامنے پیش کر دینا چاہتا ہوں جو میری "امت" کی زندگی کے فرضی توازن کو مبدل بہ انتشار کامل کر دینگے۔ وہ انتشار کامل جو زندگی کے تمام حقائق میں سب سے زیادہ ناقابل انکار حقیقت ہے!۔

رات میر صاحب سے میں نے کہا کہ میں چند روز بعد اپنی پیغمبری کا اعلان کرنے والا ہوں، ان بیچارے کا چہرہ شرقاً غرباً لمبا ہو گیا۔ کچیا داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہنے لگے، میاں! توبہ کرو! آج پیغمبری کا ارادہ ہے تو کل خدائی کا دعوٰی کرو گے؟ میں نے کہا، میر صاحب "مذہب تشکیک" کا پہلا مبلغ تم ہی کو بناؤں گا! —————— جو لوگ زیادہ اللہ والے بنتے ہیں، ان ہی میں ارتداد اور کفر کی اہلیت بھی زیادہ ہوتی ہے، ان کا کفر خفی، مرتد کے کفر جلی سے زیادہ شدید ہوتا ہے

——— میر صاحب بیچارے تمہید کے دو چار ہی کلمے سن کر عشاء کی نماز کے لئے اٹھ گئے!!

۱۳ر دسمبر۔

کل پھر نکاح کا پیغام بھیج دیا۔ جواب بھی پالیا۔ اس نے کہا ——— تقدیر میں یہی ہے تو مجھے "ہاں" کہنے کی ضرورت نہیں، وہی ہونا ہے، جو ہوگا، لیکن میرے تمہارے معاملہ میں تدبیر اور رضا و رغبت کو بھی کچھ دخل ہے تو مرجاؤنگی لیکن "ہاں" نہ کہونگی ——— نہیں! نہیں!! نہیں!!! ———

پھر اس نے میر صاحب سے کہا:۔ تم کہہ دینا کہ ان تعلقات کی شعریت میں نکاح کی خشک اور بے نمک سنجیدگی کو شامل کرکے کیوں مجھے بے مزہ کرتے ہو ——— تیتریوں کی رنگینی اور بلبلوں کے نغموں کو قفس میں بند کروگے تو رنگ اڑ جائے گا۔ نغمے فنا ہو جائیں گے! تم جو اپنی حسن پرستی پر مذہب کی جانب سے جواز کی مہر لگانا چاہتے ہو تو مجھے اپنی طرح بیوقوف کیوں سمجھتے ہو کہ میں بھی اپنی شعریت کو

مذہب کے تخیل پر قربان کر ڈالوں؟ محبت مجھ سے ہے تو کرو، مگر قبضۂ مالکانہ کی فکریں کیوں؟ جب مجھے خطرہ تھا کہ کہیں تمھاری "طلب" مجھے اسیر نہ کر لے میں بھاگی تھی۔ مگر اب جو تم وہی پیام پارینہ لے کر یہاں آئے ہو تو میں تمھاری "طلب" سے ذرا بھی نہیں ڈرتی! جواب مانگتے ہو؟ جواب یہ ہے کہ:۔ اپنے گھر جاؤ، کسی شریف خاندان کی ایک معصوم بچّی کا ہاتھ پکڑ کر قاضی صاحب سے دو بول پڑھوا لو۔ وہ تمھاری قانونی داشتہ اور مملوکہ ہو جائیگی اور تم اُس کے آقا اور مالک ——— بلا شرکت غیرے! وہ غریب جو پندرہ بیس برس تک گھر کی چار دیواری کے اندر ماں باپ کی غلامی کر چکی ہے۔ تمھاری قید میں بھی قدرے آسودہ ہوگی، اس لئے کہ اس نے آزادی کا مزہ کبھی چکھا ہی نہیں! وہ زندگی کے صرف ایک ہی رخ سے واقف ہے اور اسی میں خوش رہتی ہے اس کو کیا معلوم ——— معصوم بچّی ——— کہ غلامی کی اس دنیا کے پرے ایک اور دنیا بھی بستی ہے، جہاں عورت مرد موذی کے دھوکہ میں نہیں آتی، جہاں عورت اس طرح نہیں پہچانی جاتی کہ یہ فلاں کی بیوی یا بیٹی یا بہن یا ماں ہے بلکہ وہ اپنی شخصیت علیحدہ رکھتی ہے ——— مرد کے پھندوں سے آزاد اور سربلند! پھر اس نے میر صاحب سے کہا، میری طرف سے کہدینا۔

مجھ سے محبّت کرو، جس قدر کرنا چاہو، مگر میرے حال پر مہربانی کر کے اپنی جیب سے ہتھکڑیاں اور زنجیریں نکال کر مجھ سے یہ فرمائش نہ کیا کرو کہ میں یہ زیور پہن لوں! جب تم ان زنجیروں کو نکالتے ہو تو تمھارے آغوش میں مجھے جہنّم کی آگ بھڑکتی نظر آتی ہے ——— میں بھاگتی ہوں ——— اور تم وہ زنجیریں ہاتھ میں لئے ہوئے میرے پیچھے پیچھے بھاگتے ہو! ——— یوں میرا ہاتھ آنا مشکل ہے۔ دُنیا بہت وسیع ہے، میرے پنکھ بہت طاقتور ہیں، آج تک کسی مرد کی مجال نہیں ہوئی کہ ان پر ہاتھ ڈال سکے! جب تک مجھے چاہتے ہو، میں تمھاری چاہت کے مزے لوٹ رہی ہوں، مگر جب تم نکاح کا حربہ لیکر میری طرف بڑھتے ہو، تو زمین پر حقارت کے ساتھ تھوک کر آگے بڑھ جاتی ہوں ——— تم اور تمھارا نکاح کا پیغام! محبّت کا دعویٰ کرتے ہو اور نکاح کا پیغام دیتے ہو! محبّت کو نکاح سے کیا واسطہ؟ کہدیا ——— اس نے ہنسکر میر صاحب سے کہا ——— کہ یا تو تم بالکل گدھے ہو یا نہایت چالاک بدمعاش!!

---

۱۵ / دسمبر،

گدھے اور بدمعاش کے القابوں سے میری تواضع ہو رہی ہے۔ وہ کہتی

ہے تم تو مذہب کے قایل ہی نہیں، پھر میرے اپنے درمیان مذہب کا نام کیوں لیتے ہو؟ یہ کیا تماشہ ہے، ایک ہی چیز تمھاری رائے میں تمھارے لئے زہر قاتل مگر میرے لئے شہد خالص ہے ———— میں بھی سوچتا ہوں تو بات بے تکی معلوم ہوتی ہے، یہ بات کیا ہے کہ جب لیلیٰ کا قدم درمیان میں آتا ہے میری زندگی کا فلسفہ یکسر درہم برہم ہوجاتا ہے۔ یا تو یہ ہے کہ میں ایک مکّار مرد کی طرح عورت کے لئے ایک ایسا قانون نافذ کرنا چاہتا ہوں جو مجھ پر کسی طرح عاید نہ ہوسکے، جو آزادیاں اور حقوق اپنے کو دیتا ہوں وہی عورت کو دینا گوارہ نہیں کرتا، چاہتا ہوں کہ اس کی زندگی کا ضابطہ میرا بنایا ہوا ہو! یا تو یہ بات ہے اور یا یہ بات ہے کہ میری خواہش نے مجھے اتنا مجبور اور حواس باختہ کردیا ہے کہ میں ہر صورت سے خواہ وہ میرے عقاید کے موافق ہو یا منافی اس عورت کو اپنا بنا لینا چاہتا ہوں، لیکن وہ تو میری دلیلوں اور میری منطق کی کمزوریوں کو دیکھ رہی ہے، مرد چاہتا ہے کہ عورت کو اس کی بھی اجازت نہ دی جائے!! جب "بیش" کی حالت میں ہوتا ہوں تو کہتا ہوں کہ زندگی یہی ہے، لیکن جب عشق کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو کہتا ہوں، میرا کوئی اصول نہیں، میرا کوئی عقیدہ نہیں، اس لئے کہ میں عاشق ہوں، وہ ہنستی ہے اور میرا منہ چڑا دیتی

ہے۔ میں "عشق" سے خفا ہو کر پھر "عیاشی" کرنے لگتا ہوں اور "عیش" خوش کرنے کے لئے دنیوی زندگی کے تمام سنجیدہ اصولوں پر لات مارتا ہوں، مگر "عیش" جب تھکا دیتا ہے تو پھر "عشق" مسلط ہو جاتا ہے، پھر میں نئی نئی بحثیں اور نئے نئے مسئلے پیدا کرتا ہوں، ان گھوڑوں کو "عشق کے میدان میں دوڑاتا ہوں، وہ ہنس ہنس کر تالیاں بجاتی ہے، میں رو رو کر سینہ پیٹتا ہوں کبھی کوئی دوست کہتا ہے ایک ارادہ کر لو۔ میں بھی کہتا ہوں کہ ایک ارادہ کیوں نہ کر لوں ——— یا اِدھر یا اُدھر ——— لیکن" ارادہ کے نام سے عیش بھی ناخوش ہوتا ہے اور "عشق" بھی، وہ دونوں کہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں اس جنس کا گذر نہیں! "ارادہ" جب تک ساتھ ہو گا ہماری بارگاہ میں گھسنے نہ پاؤ گے، ان دو دیوتاؤں کے درمیان میں بہا چلا جا رہا ہوں! ——— ایک دریا کا دھارا ہے کہ مجھے بہائے لئے جا رہا ہے، پہاڑیوں کی وادیوں میں میدانوں اور صحراؤں کے سینہ پر، جنگلوں اور نخلستانوں کے سایہ میں اور تپتے ہوئے بیابانوں میں! کب تک یہ حال رہیگا۔ کہاں لیجا کر یہ دھارا مجھے سمندر کی سطح پر پٹکے گا؟ ——— سوچتا ہوں! پھر اپنے سے بگڑتا ہوں کہ سوچا کیوں، پھر سوچتا ہوں! عیش، عیش، عشق، عشق

——— ان دونوں کے درمیان کوئی راستہ پیدا ہوتا، ان دونوں سے الگ کوئی دروازہ کھلتا! کبھی کبھی مجھے فرنگی شاعر کے وہ الفاظ یاد آتے ہیں:۔

اندھیری رات میں بچّہ روتا ہے ——— روشنی کیلئے

۱۹ر دسمبر۔

اختر کہتا ہے، گھر چلو، اپنی عقل درست کرو، دماغ کے جو پیچ "ڈھیلے ہو گئے ہیں ان کو پھر تھوڑا کس دو، عورت کے لئے بیقرار ہونا، مرد کی مردانگی سے بعید ہے، شیر اگر بکری کے عشق میں بیٹھ کر رویا کرے تو فاقے کرتے کرتے مر جائے"

——— شیر اور بکری کی مثال دل پر چپکتی ہے۔ کہتا ہوں کہ لاؤ "لیلیٰ" کے دروازے کے سامنے ہی عورت کی ساری نسل کو ذلیل کروں اور کہوں کہ دیکھ، او سنگدل اور بیمروت، مرد ایسے ہوتے ہیں!

——— دوسرے ہی لمحہ میں یہ سب ارادے ہوا ہو جاتے ہیں۔ لمبا لمبا لیٹ جاتا ہوں، اختر پھر دن بھر کچوکے دیتا ہے! ———

——— رات اختر ایک بنارسی مسمات کو کہیں سے پکڑ لایا، بہت شوخ و طرّار، زبان قینچی، آنکھیں بجلی، ہاتھ پاؤں چنچل، بھویں تنی

ہوئی ــــــــــ وہ تو آکر پھیل پڑیں۔ کبھی وہ میری گود میں، کبھی میں اُنکی گود میں۔ ظالم نے اس قدر پلائی کہ میں آپے سے باہر ہو گیا۔ آدھی رات گذر گئی، مجھے ہوش نہ تھا کہ کہاں ہوں! ہزاروں قصّے، ہزاروں داستانیں حُسن کی کارفرمائیاں، عشق کی فتحمندیاں، سب ہی کچھ کہا اور سنا گیا۔ اُس نے اپنے عاشقوں کے قصّے سُنائے، میں نے اپنے معشوقوں کے افسانے، کہنے لگی بتاؤ تم نے سب سے زیادہ کس کو چاہا؟ میں نے کہا "لیلیٰ" کو ــــ مگر اب اُس سے نفرت ہے! کہنے لگی، اگر نفرت ہے تو تم جھوٹے ہو تم نے چاہا ہی نہیں! میں نے کہا۔ چاہا تو ایسا کہ کوئی کیا چاہے گا؟ مگر اس نے قدر نہ کی۔ ــــــــ

کہنے لگی، وہ تمھیں پہچان گئی ــــــ خالی ڈھول کو ہر عورت پہچان لیتی ہے ــــ میں نے کہا ــــ کم ظرف ہے، وہ کہنے لگی، کم ظرف وہ نہیں تم ہو ــــ اس کے آئینہ میں تم نے اپنی صورت دیکھ لی ــــــــ غرض بات بڑھتی گئی ــــــ شراب کا دور چلتا گیا، بات بڑھتی گئی ــــــ میں نے کہا، میں اُسے جلانا چاہتا ہوں، ذلیل کرنا چاہتا ہوں، دکھا دینا چاہتا ہوں کہ اس سے زیادہ حسین عورتیں مجھے نصیب ہیں ــــــ چل! میں نے کہا، چل ذرا "لیلیٰ" کے گھر چلیں، تو ذرا اس سے دو باتیں کر اور میں ذرا اپنے کلیجہ کے چھالے

چھوڑوں ——— میں سمجھتا تھا، وہ نہ راضی ہوگی، وہ تو راضی ہوگئی! ہم دونوں اسی وقت "لیلیٰ" کے گھر پہونچے، مشکل سے دروازہ کھلوایا، بستر پر لیٹ چکی تھی، مجھے دیکھ کر اٹھ بیٹھی۔ میں نے ہاتھ پکڑ کر نبار سی مسمات کو آگے بڑھایا ——— "معاف کرنا "لیلیٰ" ہم اور یہ ہوا خوری کے لئے نکلے تھے۔ جی چاہا کہ تم سے بھی ملتے چلیں" ——— وہ مسکرائی: "تشریف رکھئے، چشم ما روشن ——— آدھی رات کی ٹھنڈی ہوا کچھ میرے لئے بھی لائے ہوتے ——— بہت حبس ہے"۔ دونوں کا تعارف کرا کے میں تو فرش پر لیٹ گیا ——— دیکھوں یہ دونوں تیتریاں کس طرح ایک دوسرے پر حملے کرتی ہیں ——— "لیلیٰ" ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ اس کے چہرے پر میری اس عجیب حرکت کا کوئی اثر ظاہر نہ ہوتا تھا۔ اس کے لبوں پر وہ لازوال تبسم جو میں نے کسی دوسرے کے لبوں پر آج تک نہیں دیکھا، بدستور موجود تھا۔ آنکھوں میں ایک قہقہہ جھوم رہا تھا، لہجہ میں شرارت تھی جو اثر میں پیدا کرنا چاہتا تھا اس کا ہلکا سا عکس بھی نمایاں نہ ہوا۔ میں نے مایوس ہو کر آنکھیں بند کر لیں ——— تمھیں نیند آ رہی ہے، سو جاؤ، میں دوسرے کمرے میں آرام کرونگی، یہ کہہ کر اس نے میرے

شانہ پر ہاتھ رکھدیا، نشہ میرا تیز تھا، اس ہاتھ سے نکل کر بجلی کی ایک رَو جسم میں دوڑی ـــــ مَیں نے کہا، نہیں، میں جاؤنگا، کھڑا ہو گیا، ٹانگوں نے سہارا نہ دیا، پھر بیٹھ گیا ـــــ "لیلیٰ" نے کہا۔ "اب تم دونوں کو نہ جانے دونگی میرا بستر خوش قسمتی سے آج خالی ہے ـــــ وہ مسکرائی ـــــ تم دونوں آرام کرو ـــــــــ اس کے بعد کچھ مَیں نے کہا ـــــ یاد نہیں کیا کہا، ـــــ کچھ اس نے کہا، یاد نہیں کیا کہا ـــــ صبح آنکھ کھُلی تو میں نے اپنے کو اُس کے بستر پر پایا، میرے پہلو میں وہ بنارسی مسمات سو رہی تھیں، اُن کے مُنہ کی بھاپ میرے رخساروں سے ٹکرا ٹکرا کر سارے کمرے کو گرم کر رہی تھی ـــــ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا! ـــــــــــ

"لیلیٰ!" ـــــ "لیلیٰ" اختر نے کمرے کا دروازہ کھولا، ـــــ "کہاں ہے؟" میں نے سوال کیا۔ اختر نے کہا۔ "وہ تو چلی گئیں، صبح میرے یہاں آنے سے پہلے ہی روانہ ہو چکی تھیں، ایک ملازم اور کچھ سامان باقی ہے، ملازم کہتا ہے کہ بمبئی گئیں، ـــــــ خدا ہی جانے! ـــــ تمھارے نام یہ ایک پرچہ لکھ کر دے گئی

ہیں ——————— لکھا تھا:۔ "رات کا کھیل بھونڈا تھا، مگر میں خوش ہوں، اپنی زندگی کی شعریت کو فنا نہ ہونے دو۔ کھیلے جاؤ، زندگی کے اس چٹان پر زمانے کے طوفانوں کی کچھ پروا نہ کرو، جھولوں میں جھولو، باغوں میں کھیلو، اور کبھی سوچو مت! جب تک غور و فکر سے آزاد رہو گے، سوچنا موت کا پیام ہے، کچھ مت سوچو! یہ وہ نسخہ ہے جو میں خود بھی استعمال کرتی ہوں ——————— میں توکل سے پہلے ارادہ کر چکی تھی، بنارس جانا ضرور تھا، تمھاری نیند کو خراب کرنا مناسب نہ سمجھا ——————— یہ دنیا بہت تنگ ہے، اس لئے یقیناً کسی دن پھر ہم تم ملیں گے ——————— گم نہیں ہو سکتے ——————— خدا حافظ!"

خاتمۂ کلام،

رات میں نے اُس کو قتل کر ڈالا تھا!
وہی جو میرے اندر بیٹھا رہا کرتا تھا —
وہ جو مجھے ڈراتا تھا، دھمکاتا تھا، —
وہ جو ہر وقت میرے دل کو کریدتا رہتا تھا
کبھی کہتا تھا یہ نہ کیجیو، یہ گُناہ ہے
کبھی کہتا تھا یہ کرو، یہ ثواب ہے
کبھی کہتا تھا، تو دوزخ میں جائے گا
کبھی کہتا تھا، تو جنت کے قابل بن جا،
وہ جو میرے عیش کو چٹکیاں لیکر پراگندہ کرتا تھا
وہ جو سوئیاں چبو کر مجھے بیچین کرتا رہتا تھا،
کبھی جنّت یاد دلاتا تھا، کبھی دوزخ! —
کبھی روح اور خدا اور موت کے فسانے سناتا تھا
کہانیاں، — جھوٹی! داستانیں، — لغو حکایتیں، — بے معنی!!

رات مَیں نے اس بے تمیز کو قتل کر ڈالا!!

اور میں مطمئن ہو کر سو گیا! ——————

صبح میں نے اپنے سینہ پر ہاتھ رکھا، یہ سمجھ کر کہ مقتول کی جگہ خالی ہوگی

لو! وہ تو پھر وہاں موجود تھا! ——— وہی کمبخت! ———

——— اس نے کہا، گدھے! تو ہر رات مجھے قتل کریگا،

میں ہر صبح زندہ ہو کر اپنے مسکن میں آبیٹھوں گا! ———

ہر روز، ہر صبح تو مجھے یہیں پائیگا جہاں ہوں ———

مہذب، متمدن، ——— جانور!" ———

اب کوئی مجھے بتائے میں کیا کروں؟؟

روزنامچہ

میں

ایک بازاری مرد کی نفسیات کا مطالعہ کرنے کے بعد

لیلیٰ کے خطوط

میں

ایک بازاری عورت کی خونچکاں داستان پڑھیے

مے خانہ کے ایک ساغر گرداں سے

اس شراب کے چند قطرے

جس میں ایک غم نصیب، زخم نصیب عورت کا خونِ جگر شامل ہے

مصنفہ

جس طرح روزنامچہ اردو ادب میں ایک نیا اقدام ہے اسی طرح

لیلیٰ کے خطوط بھی نفسیات کا ایک نیا مطالعہ ہے

بقلم قاضی عبد الغفار

قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

دار الادب پنجاب بارود خانہ سٹریٹ لاہور

زندگی کے معمولی حقائق کو

اردو زبان کا ایک ادیب کس طرح ایک فلسفہ لطیف میں منتقل کرتا ہے اور
کس طرح زندگی کی ادنیٰ واردات کو معنویت کی بلند سطح پر لے جاتا ہے
اس کا ایک بہترین نمونہ وہ کتاب ہے جو

"اُس نے کہا"

کے عنوان سے ہم شائع کر رہے ہیں

یہ شاہکار

ایک ادعا ہے، اس امر کا، ایک دلیل ہے، اس واقعہ کی
کہ اخلاقیات اور معاشرت کا قدیم لباس بھی

ادبِ لطیف

کے جسم پر کس قدر موزوں کیا جا سکتا ہے
قاضی عبدالغفار صاحب کا نام دنیائے ادب میں
اس امر کی دلیل ہے کہ ہمارا دعوےٰ غلط نہیں

قیمت .... دو روپے مجلد

دارالادب پنجاب بارود خانہ سٹریٹ لاہور